محاسنِ الفاظِ غالبؔ

نذیر احمد ایم، اے (انگریزی و فارسی) ایم، او، ایل
ریٹائرڈ پرنسپل، گورنمنٹ انٹرمیڈیٹ کالج، ملتان

کتابیات لاہور

سلسلہ مطبوعات نمبر ۲۰

ناشر :—— ولید میر
ناظم کتابیات ، لاہور

مطبع :—— شاہنواز پرنٹنگ پریس ، لاہور

تاریخ اشاعت :—— مئی ۱۹۶۹ء

قیمت :—— ۱۰ روپے

فہرست مضامین

—○—

زمانے کے ذوق اور فکر و نظر کی رفتار و اسلوب کے پیشِ نظر ایسی کوئی اور کتاب مرتب ہونے کے ممکنات بہت ہی کم نظر آتے ہیں اس لیے کہ صنائع بدائع سے رغبت و دل بستگی کا دائرہ بالکل محدود رہ گیا ہے اور برابر سمٹتا جا رہا ہے۔

میں اپنی حالت پہ نظرِ بازگشت ڈالتا ہوں تو میرزا غالبؔ کے کلام سے شوق و شغف اور مُزاولت کا آغاز اس وقت ہوا تھا جب میں سِنِ عمر کے پندرھویں یا سولھویں مرحلے میں تھا اور اب حیاتِ مستعار کے چوہتر سال پورے ہونے میں صرف چند روز رہ گئے ہیں۔ لیکن مجھے اس اعتراف میں تامّل نہ ہونا چاہیے کہ کلامِ میرزا کے جن پہلوؤں پہ میرے فاضل دوست نے ایک جامع کتاب مرتب فرمادی، ان پر میری نظر شاذ ہی پڑی۔

میں اپنے آپ کو اس کتاب پر بطورِ تعارف کچھ لکھنے کا اہل نہیں سمجھتا تھا، کیونکہ صنائع بدائع میں میرے سرمایہ آگہی کو قرآن مجید کے الفاظ کے مطابق "بضاعت مزجات" کی حیثیت حاصل ہے۔ لیکن فاضل مصنف کے ارشادِ گرامی کے امتثال میں مل کا حوصلہ نہ ہُوا اور اپنے دل کو یہ سوچ کر تسلی دے لی کہ :

بلبل ہمیں کہ قافیہ گل شود بس است

آپ نے میرزا کا یہ شعر بارہا پڑھا اور سنا ہو گا :

گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھیے
جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آوے

اس کا ایک جامع اور دل آویز مرقع یہ کتاب بھی ہے، جس کے مطالعے سے آپ کو مندرجہ بالا شعر کی توفیق کے سیکڑوں شواہد مل جائیں گے۔

اصل کتاب چھ ابواب پر مشتمل ہے۔ ابتدائی تین ابواب میں صنائع بدائع کی حقیقی حیثیت اور سرگزشت مثالوں کے ذریعے سے واضح کی گئی ہے۔ نیز بتایا گیا ہے کہ فارسی اور اردو شاعری میں صنائع بدائع کی کیفیت کیا رہی۔ باقی تین ابواب اردو اور فارسی کلامِ غالب کے صنائع بدائع سے متعلق ہیں۔ ہر صنعت کے سلسلے میں میرزا کے فارسی اور اردو اشعار سے اتنی مثالیں پیش کی گئی ہیں کہ کہا جا سکتا ہے میرزا کے کلام کا خاصا حصہ اس میں کتاب میں آ گیا ہے۔

میں گزارشات کو طول دے کر ان مطالب کا اعادہ نہیں کرنا چاہتا تھا، جن پر اصل کتاب مشتمل ہے لیکن اس کی ایک خصوصیت کا ذکر میرے نزدیک بے حد ضروری ہے۔ صنائع بدائع کے متعلق مباحث کے سلسلے میں عام تصور غالباً یہی ہے کہ یہ خشک، بے کیف اور غیر جاذب ہوتے ہیں، لیکن میرے عزیز دوست نے بیان و نگارش کا ایسا انداز اختیار فرمایا ہے جو حد درجہ دل پذیر اور جاذب ہے۔ خود میں نے مسودہ پڑھنا شروع کیا تو دل یہی چاہتا تھا کہ مباحث کا یہ سلسلہ اختتام پذیر نہ ہو۔ پھر اس سے عام و خواص یکساں محظوظ ہو سکتے ہیں۔

"محاسن الفاظ غالب" بے شائبہ ریب، "غالبیات" کے سلسلے کی ایک نہایت اہم، مفید اور بلند پایہ کتاب ہے، جس سے کلامِ غالب کی خوبیاں ذہن نشین کر لینے کے علاوہ معارف ادبیات کے سلسلے میں بھی بصیرت کی خاص روشنی حاصل ہو سکتی ہے۔ یقیناً یہ کتاب بھی میرزا کے اس دعوے کی ایک مستند اور قیمتی توثیقی دستاویز ہے:

گر تنزل نہ بود، ابر بہاری غالب
کہ دُرِ افشانی مرزا نشاندہ شمارے نہ دہی

غلام رسول مہر

حرفِ آغاز

آج سے تقریباً چالیس سال پہلے کی بات ہے۔ کہ میں نے نظامی عروضی سمرقندی کا چہار مقالہ پہلی بار پڑھا۔ مقالہ دوم میں شعر کی ماہیت اور شاعری کے حسن و قبح پر بحث کی گئی ہے۔ اور اُس کے بعد کچھ حکایات مشہور شعرا کے متعلق ہیں۔ اُن میں سے ایک حکایت فارسی کے مشہور شاعر رودکی سے تعلق رکھتی ہے جو نصر بن احمد سامانی کا درباری شاعر تھا۔ اور جسے فارسی کا پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔

اُس حکایت میں بیان کیا گیا ہے۔ کہ جب امیر نصر بن احمد سامانی نے خراسان کو فتح کر لیا۔ اور ہرات کی فرحت بخش آب و ہوا اس کو پسند آئی تو اُس نے وہیں ڈیرے جما دیئے اور بخارا جو کہ سامانیوں کا اصلی تخت گاہ تھا۔ اُس کے دل سے فراموش ہو گیا۔ لشکر کے سردار اور اعیان اُمرا جو بخارا میں عالی شان عمارتیں اور عمدہ باغات رکھتے تھے۔ ہرات میں رہتے رہتے اُکتا گئے۔ اور اہل ہرات بھی سپاہ کے زیادہ ٹھہرنے سے گھبرا اُٹھے سب نے اُستاد ابوالحسن رودکی سے درخواست کی کہ کسی طرح امیر کو بخارا کی طرف مراجعت کرنے کی ترغیب دے۔ رودکی نے ایک قصیدہ لکھا اور جس وقت امیر شراب اور راگ رنگ میں محو ہو رہا تھا۔ اُس کے سامنے نہایت دل سوز آواز سے پڑھا اس قصیدہ نے امیر کے دل پر ایسا اثر کیا۔ کہ جمی جمائی محفل چھوڑ کر اُسی وقت اُٹھ کھڑا ہوا۔ اور بغیر موزہ پہنے گھوڑے پر سوار ہو کر مع لشکر کے بخارا کو روانہ ہو گیا اور دس

کوس پہ جا کر پہلی منزل کی اور بخارا تک کہیں نہ رکا۔ رودکی کو امرائے لشکر سے زر موعود سے پانچ ہزار دینار زیادہ دیئے۔ یہ واقعہ بیان کرنے کے بعد نظامی لکھتا ہے:۔

"والحق آں بزرگ بدیں تجمل ارزانی بود۔ کہ ہنوز ایں قصیدہ را کس جواب نگفتہ است کہ مجال آں ندیدہ اند کہ از مضایق آزاد تواں بیروں آیند۔ واز عذب گویاں و لطیف طبعان عجم یکی امیر الشعراء معزی بود کہ شعر او در طلاوت وطراوت بغایت است و در روانی و عذوبت بہ نہایت۔ ابو سعد ہندو بن محمد بن ہندو الاصفہانی از وی درخواست کہ وکہ آں قصیدہ را جواب گوی۔ گفت۔ نتوانم۔ الحاح کرد چند بیت بگفت کہ یک بیت از ان بیتہا این است:۔

رستم از مازندراں آید ہمی
زین ملک از اصفہاں آید ہمی

ہمہ خردمنداں دانند کہ میان ایں سخن و آں سخن چہ تفاوت است وکہ تواند گفتن بدیں عذبی کہ او در مدح ہمی گوید دریں قصیدہ ؎

آفریں و مدح سود آید ہمی
گر بگنج اندر زیاں آید ہمی

واندریں بیت از محاسن ہفت صنعت است۔ اول مطابق دوم متضاد، سوم مردف، چہارم بیان مساوات، پنجم عذوبت، ششم فصاحت، ہفتم جزالت۔ و ہر اُستادی کہ اُورا در علم شعر تبحری است چوں اندکی تفکر کند داند کہ من در مصیبم۔ والسلام۔"

اِس حکایت کے اِن آخری الفاظ نے "واندریں بیت از محاسن ہفت صنعت است" میرے دامن دل کو ایسا جھٹکا دیا۔ کہ آج تک اُس کا اثر موجود ہے۔ میں نے کتب بلاغت میں ان اصطلاحات کی تعریف و تشریح کی تلاش شروع کر دی۔

انہی دنوں میں صنایع بدایع کا مطالعہ کرتے ہوئے ناسخ کا یہ سادہ سا شعر نظر سے گزرا:۔

کچھ تری بات کو ثبات نہیں
ایک ہاں ہے تو پانچ سات نہیں

بتایا گیا تھا۔ کہ اس شعر میں صنایع بدایع کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی لفظی صنعت باتؔ اور ثباتؔ میں ہے۔ اسے صنعت تجنیس زائد یا ناقص کہتے ہیں۔ دوسری لفظی صنعت پانچ سات میں ہے۔ اس کا نام سیاق الاعداد ہے اور تیسری معنوی صنعت ہاںؔ اور نہیںؔ میں ہے۔ ہاںؔ اقرار کے معنوں میں استعمال ہوا ہے اور نہیں انکار کے معنوں میں۔ اقرار اور انکار میں تضاد ہے۔ اس لئے ہاںؔ نہیںؔ میں صنعت ایہام تضاد ہے۔

زندگی میں بعض معمولی اور غیر اہم واقعات غیر معمولی نتائج کے حامل ہوتے ہیں۔ رودکی اور ناسخ کے ان دو شعروں اور ان کے لفظی اور معنوی محاسن نے میرے سمندِ شوق کو ایسا تازیانہ لگایا۔ کہ وہ تجسس اور تحقیق کے میدان میں تیز تیز دوڑنے لگا۔ اور میں بلاغت اور فصاحت کی کتابوں اور محاسن الفاظ کے مضامین میں زیادہ دلچسپی لینے لگا۔ اور صنایع بدایع کی اردو اور فارسی مثالوں سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

اس بات کا دوسرا اثر یہ ہوا۔ کہ آج تک جب کبھی میں کوئی شعر پڑھتا یا سنتا ہوں۔ تو سب سے پہلے میری توجہ اُس کے لفظی محاسن پر مبذول ہوتی ہے۔ اور ایک شعر کے مقابلہ میں دوسرے ایسے اشعار ذہن میں آجاتے ہیں۔ جو متحد المضمون ہوتے ہیں۔ لیکن حسنِ الفاظ کے لحاظ سے دونوں میں بہت تفاوت ہوتا ہے یہی تقابلی مطالعہ اس امر کا محرک ہوا۔ کہ میں وقتاً فوقتاً مشاہیر شعراء کے کلام بلاغت نظام سے صنائع بدایع کے موتی چن چن کر یادداشتوں کے خریطے بھرتا رہا۔ حتیٰ کہ میرے پاس ان نایاب موتیوں کا کافی ذخیرہ جمع ہو گیا۔ میرا ارادہ تھا۔ کہ اُردو زبان کے تمام مشہور شاعروں کی لفظی صنعت گری پر ایک مفصل اور مبسوط کتاب تیار کروں۔ لیکن ابھی تک اس ارادہ کو عملی جامہ نہیں پہنا سکا۔ دیکھئے۔ کب یہ توفیق ارزانی ہو۔ وَمَا تَوفِیقِی اِلّا بِاللہ۔

پاکستان کے مایۂ ناز اور شہرۂ آفاق شاعر علامہ اقبالؔ کے کلام میں صنایع بدایع کی بے شمار مثالیں ہیں۔ وہ تمام مثالیں میرے پاس اوراقِ پریشاں کی صورت میں موجود تھیں۔ بعض احباب نے مشورہ دیا کہ ان کو ترتیب دے کر کتابی صورت میں شایع کرنا چاہئے۔ چنانچہ علم بدیع پر میری یہ کتاب "اقبال کے صنایع بدایع" کے نام سے آئینہ ادب چوک مینارہ، انارکلی لاہور سے ۱۹۶۶ء میں شائع ہوئی۔ جس کی صائب الرائے تبصرہ نگار اور تنقید نگار حضرات نے تعریف کر کے میری حوصلہ افزائی کی اور تلاشِ محسناتِ شعر میں میری محنت کی داد دی۔ اور جس کے لئے میں اُن کی خدمت میں صمیمِ قلب سے ہدیۂ تشکر پیش کرتا ہوں۔

اردو اور فارسی کے عظیم ترین شاعر غالبؔ (جس کا دیوان بقول عبدالرحمٰن بجنوری مرحوم ہندوستان

کی دو الہامی کتابوں میں سے ایک ہے، جس نے بزمِ ہستی میں ایک ایسا فانوسِ خیال روشن کیا کہ کونسا پیکر ہے جو اس کے کاغذی پیرہن پر منازلِ زیست قطع کرتا ہوا نظر نہیں آتا[1]۔ جس نے بقول آزاد شہرتِ عام اور بقائے دوام کے دربار میں ایک ممتاز جگہ پائی[2]، جس نے فکر کی انتہائی بلندیوں کو چھو کر یہ ظاہر کیا کہ پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا ہے[3]۔ جس نے فنِ شعر کو فنونِ لطیفہ میں سے بلند ترین درجہ پر پہنچایا، جس نے شعر کو سحر بنا دیا) اُس عظیم ترین شاعر کی صد سالہ برسی فروری ۱۹۶۹ء میں منائی جا رہی ہے۔

ہندوستان اور پاکستان میں شمعِ اردو کے پروانے اور کلامِ غالب کے دیوانے بے شمار ہیں۔ دونوں ملکوں کے زبان دان اور کلامِ غالب کے قدردان اپنی اپنی ہمت اور استعداد کے مطابق اس تقریب پر اپنی عقیدت مندی کے پھول نثار کرنے کے لئے کلامِ غالب کے سدا بہار چمن سے گلچینی کر رہے ہیں۔ یونیورسٹیوں، کالجوں، علمی درسگاہوں اور ادبی اداروں کے در و دیوار سے اسد اللہ الغالب کی صدا گونج رہی ہے۔ اور غالب مرحوم کی یہ پیشگوئی پوری ہو رہی ہے کہ ؎

کوکبم را در عدم اوجِ قبولی بودہ است
شہرتِ شعرم بگیتی بعد من خواہد شدن

اس موقع پر میرے ایک دوست نے مشورہ دیا۔ کہ میں کلامِ غالب کے گلہائے صنعت سے صنایع بدایع کا ایک ایسا گلدستہ تیار کروں۔ جو ایوانِ ادب کی زینت کا سامان ہو اور اس تقریب کے شایانِ شان ہو۔ چنانچہ میں نے اپنے یادداشت کے کاغذات کو مرتب کرنا شروع کیا۔ عنایتِ ایزدی میرے شاملِ حال رہی اور یہ خداوند کریم کا کرم ہے کہ آج یہ گلدستۂ عقیدت غالب کے قدردانوں اور عقیدت مندوں اور سخن فہموں کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں۔

ع من نیز حاضر می شوم تصویرِ جاناں در بغل

---

[1] مقدمہ دیوانِ غالب ۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری

[2] نیرنگِ خیال ۔ آزاد

[3] بانگِ درا ۔ اقبال

— فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ ظاہر ہوا ہے پرِ مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا

صنایع بدایع شعر کے حسن میں اضافہ کا سامان ہیں۔ اور اس لحاظ سے شعر کی جان ہیں۔ یہ مثال کے طور پر سات سنگار ہیں اور محبوبۂ سخن کے لئے جواہرات کا ہار ہیں۔ اسی کحل الجواہر سے سخن فہمی کی بصارت کو تیز اور اسی بادۂ ناب و نایاب سے جام سخن کو لبریز کیا جاتا ہے۔ صنایع بدایع ناطورۂ سخن کے خد و خال کو جلا اور سخن شناسوں کو بصیرت کی ضیا بخشتے ہیں۔ لیکن یہ اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ کہ حسن معنی اس غازہ کا محتاج نہیں ؎

زعشق ناتمام ما جمال یار مستغنی است
بآب و رنگ و خال و خط چہ حاجت روی زیبا را

صنایع بدایع ہر دور کے شاعروں کے کلام میں موجود ہیں صرف درجات کا تفاوت ہے۔ لیکن ہر دور کے شاعر اعلان کرتے رہے ہیں۔ کہ ہمارا کلام صنایع بدایع سے خالی ہے اور ہر زمانے کے سخن فہم صنایع بدایع کو حسن کلام کا عارضی زیور خیال کرتے رہے ہیں۔ شاعر اپنے کلام کے چہرے کو اس غازہ سے سجاتے بھی رہے ہیں اور اسے عیب کی طرح چھپاتے بھی رہے ہیں۔ صنایع بدایع کا حال دُنیاوی جاہ و جلال اور زر و مال کا سا ہے۔ ہر شخص کی زبان اور ہر واعظ کے بیان سے دنیا کے زر و مال سے نفرت کا اظہار ہوتا ہے۔ اور قولاً سب یہ کہتے ہیں کہ ؎

دُنیا ہیچ است و کارِ دُنیا ہمہ ہیچ
اے ہیچ برائے ہیچ باہیچ مپیچ [1]

مگر عملاً ہر آدمی زر و مال کی محبت میں مبتلا ہے اور حصولِ زر و مال کے لئے ہر جائز اور ناجائز وسائل اختیار کرتا ہے حتیٰ کہ ترک دنیا کی تعلیم دینے والے اور علائق دنیوی سے آزاد رہنے کی تلقین کرنے والے بھی خود زر و مال کی محبت میں مبتلا ہیں

سعدی ؎ ترکِ دنیا بمردم آموزند
خویشتن سیم و غلہ اندوزند

بالکل یہی حال ہمارے شاعروں کا ہے۔ اپنے اشعار کو صنایع بدایع سے مزین بھی کرتے ہیں۔ اور اس

---

[1] اس شعر میں بھی صنایع بدایع کی تین قسمیں ہیں۔ تجنیس تام۔ تجنیس زاید و ناقص اور صنعت تکرار

سے تبری و تحاشی بھی کرتے ہیں۔ آپ اگلے صفحات میں دیکھیں گے کہ صنایع بدایع کو کم نگاہی سے دیکھنے والے اور پائے استحقار سے ٹھکرانے والے شاعروں کے کلام میں بھی صنایع بدایع کثرت سے موجود ہیں۔

اگر یہ کہا جائے کہ غالب کے اردو اور فارسی اشعار میں صنایع بدایع کی کثرت ہے۔ اور یہ صنایع بدایع از خود پیدا نہیں ہوئے۔ بلکہ ان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور ان کی جلوہ گری میں شاعر کے قصد اور صناعی کا دخل ہے۔ تو ممکن ہے کہ غالب کے بعض طرفدار (جو سخن فہم نہیں ہیں) میری اس جسارت کو برداشت نہ کر سکیں اور میری بات کی تاب نہ لا سکیں۔ اور اس حقیقت کو الزام اور تہمت کا نام دے کر زبان طعن سے مجھے کہیں کہ

بروایں دام بر مرغ دگر نہ

کہ عنقا را بلند است آشیانہ

لیکن حقیقت کا چراغ جانبداری کی پھونکوں سے بجھایا نہیں جا سکتا۔ حقیقت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔

غالب کے اکثر تذکرہ نگاروں نے غالب کی اس صناعی کا ذکر کرنے سے گریز کیا ہے۔ مولانا حالی نے یادگارِ غالب میں صنایع بدایع کی موجودگی کا اشارۃً ذکر کیا ہے۔ ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے حالی کی تائید اور تصدیق دبی زبان سے کی ہے۔ نیاز فتحپوری نے نسبتاً بلند آواز سے اعلان کیا ہے۔ کہ غالب کے اکثر اشعار میں رعایت لفظی سے کام لیا گیا ہے۔ اور چند اشعار کی نشان دہی بھی کی ہے جن میں رعایت لفظی سے کام لیا گیا ہے۔ محمد نجم الغنی رامپوری نے فصاحت و بلاغت پر ایک مستند اور جامع کتاب "بحرالفصاحت" کے نام سے تالیف کی۔ اور اس میں علم معانی، علم بیان، علم بدیع، علم عروض وغیرہ کے ضمن میں انشاء، جرأت، مصحفی، آتش، ناسخ، مومن، غالب، ذوق اور ظفر وغیرہ مشہور شاعروں کے کلام سے مثالیں دی ہیں۔ علم بدیع کے بیان میں کئی صنایع بدایع کی وضاحت کے لئے غالب کے پچیس مختلف اشعار پیش کئے ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہوا کہ بحرالفصاحت کے مؤلف کو غالب کے اشعار میں بیس پچیس صنایع بدایع نظر آئے۔ میں نے جب بنظر امعان اردو دیوان کا مطالعہ کیا۔ تو مجھے غالب کے اشعار میں تقریباً وہ تمام صنایع بدایع نظر آئے۔ جن کا ذکر بلاغت کی کتابوں میں کیا گیا ہے صرف ایک صنعت (طباق یا تضاد) کی ایک سو چالیس مثالیں میں نے اس کتاب میں پیش کی ہیں۔ اور ابھی غالب کے فارسی کلام کا بہت سا حصہ اس میں شامل نہیں کیا گیا۔

ان شواہد کی بنا پر میں نے یہ کہنے کی جسارت کی ہے کہ غالب صنایع بدایع کے استعمال میں کسی دوسرے

شاعری پر تبصرہ نہیں رہا۔ البتہ غالب کے طرفدار مجھے معاف فرمائیں گے اور سخن فہم اور حقیقت پسند حضرات غالب کی اس حقیقت کی نقاب کشائی اور جلوہ گری سے لطف اندوز ہوں گے۔ مجھے اپنی اس کوتاہی کا احساس ہے کہ میں نے بہت اختصار سے کام لیا ہے۔ فارسی اور اُردو کے ہر دَور کے صرف دو دو شاعروں کا انتخاب کیا ہے۔ اور پھر اُن دو شاعروں کے کلام پر بھی سیر حاصل تبصرہ نہیں کیا۔ صرف چند مثالوں پر اکتفا کیا گیا ہے۔ میرا اصل مقصد کلام غالب میں سے صنایع بدایع کی مثالیں پیش کرنا ہے باقی شعرا کا ذکر اس لئے کیا گیا ہے کہ اُن کا کلام کسی نہ کسی طرح سے غالب پر اثر انداز ہوا ہے۔ اور غالب نے صنایع بدایع میں ان کی تقلید کی ہے۔ اس لئے اُن کے ذکر میں اختصار سے کام لیا گیا۔

میں نے سب سے پہلے الفاظ کے حسن کو دکھانے کی کوشش کی ہے۔ اور یہ واضح کرنا چاہا ہے کہ الفاظ کے اندر ایک اپنا حُسن ہے۔ اور الفاظ کی بندش سے۔ الفاظ کی ترکیب سے، الفاظ کی تقدیم تاخیر سے، الفاظ کے ردوبست سے مختلف دلکش صورتیں یا قوس قزح کے سے رنگ پیدا ہو جاتے ہیں۔ جن کو علم بدیع میں صنایع بدایع کہتے ہیں۔

دوسرے باب میں فارسی شاعری پر مختصر سا تبصرہ کیا گیا ہے اور ظاہر کیا گیا ہے کہ فارسی شعرا نے صنایع بدایع کا استعمال کس حد تک کیا ہے۔ تیسرے باب میں اردو شاعری پر نظر ڈالتے ہوئے ہر دور کے نمائندہ شاعروں کے کلام میں سے صنایع بدایع کی مثالیں پیش کی گئی ہیں۔ ذوق اور ظفر کے کلام پر زیادہ روشنی ڈالی گئی ہے۔ کیونکہ اول الذکر غالب کا حریف اور موخر الذکر غالب کا ممدوح تھا۔ چوتھے باب میں غالب کی صناعی کا قدرے تفصیل سے ذکر کرتے ہوئے پانچویں باب میں صنایع بدایع لفظی اور چھٹے باب میں صنایع بدائع معنوی کی اقسام اور مثالیں درج کی گئی ہیں

بو کہ بجنوں بشنوی قصۂ ما و مدعی
تازہ ز رُوئیدادِ شہر طرح فسانہ کردہ ایم

نذیر احمد
گلگشت ملتان
۳ر جنوری سنہ ۱۹۶۹ء

باب اوّل

حُسنِ الفاظ

لفظ کیا ہے؟ لفظ کب بنا؟ کیسے بنا؟ زبان کب اور کیسے پیدا ہوئی؟ لفظ کی حقیقت پر بحث کرتے ہوئے اس قسم کے کئی سوالات خود بخود ذہن میں آ جاتے ہیں۔ اور عجیب الجھن سی پیدا کر دیتے ہیں بظاہر اس قسم کے سوالات عقدۂ لاینحل معلوم ہوتے ہیں۔ ان کا حل تلاش کرنے میں سائنس بھی ہماری مدد نہیں کر سکتی۔ ڈارون کا نظریہ ارتقاء بہت دلچسپ اور بڑا مدلّل ہے لیکن ارتقا کی بہت سی کڑیاں اس میں بھی نامربوط رہ جاتی ہیں۔ فلسفہ و حکمت بھی تکوین کائنات اور تخلیق آدم کی وضاحت سے عاجز ہیں دنیا کے دیگر مادی علوم بھی اس معمّا کو حل کرنے سے قاصر ہیں۔ اس لئے ہمیں مذہب کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

ع کافر نتوانی شد ناچار مسلماں شو

اور پہلے ہستی باری تعالےٰ پر ایمان لانا پڑتا ہے۔ کہ وہ قادر مطلق شروع سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔ وہ ابتدا سے ہے اور اس کی کوئی انتہا نہیں۔ وہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ اس قادر مطلق نے چاہا کہ دنیا پیدا ہو جائے۔ اور دنیا پیدا ہو گئی۔ پھر خداوند تعالےٰ نے زمین پر اپنا ایک خلیفہ یا نائب مقرر کرنا چاہا۔ تو حضرت آدم کو پیدا کیا۔ پھر حضرت حوّا کو پیدا کیا۔ اور آدم و حوّا سے بنی آدم پیدا ہوئے۔ تو الدو تناسل

کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

آدم کو خداوند تعالٰے نے قوت گویائی دی۔ اور بولنے کے لئے زبان کے الفاظ سکھائے۔ وَعَلَّمَ آدَمَ الْاَسْمَاءَ کُلَّهَا کی یہی تفسیر ہے کہ خدا نے آدم کو اسماء کی تعلیم دی۔ یعنی الفاظ پڑھائے۔ بولنا سکھایا۔ اور اس طرح سے دنیا میں پہلی زبان کی تخلیق ہوئی۔ یعنی جب سے انسان کتم عدم سے منصہ شہود پر جلوہ گر ہوا۔ اسی وقت سے زبان اور الفاظ بھی دنیا میں وجود پذیر ہوئے

تکوین عالم اور تخلیق ۔ ۔ ۔ ایک لفظ "کُن" کے مرہون منت ہیں اس لحاظ سے لفظ ایک مقدس چیز ہے۔ لفظ کی تقدیس کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ کہ خالق کائنات نے آدم کو اسماء (الفاظ) کی تعلیم خود دی۔ شعرا لفظ کُن کی عظمت و تقدیس کے گیت شروع سے لے کر اس وقت تک گاتے چلے آ رہے ہیں۔

صبح ازل جو حُسن ہوا دلستان عشق
آوازِ کُن ہوئی تپش آموز جانِ عشق
یہ حکم تھا کہ گلشن کُن کی بہار دیکھ
اک آنکھ لیکے خواب پریشاں ہزار دیکھ (اقبال)

اولاد آدم بڑھتی گئی اور زمین میں پھیلتی گئی۔ جب ایک علاقہ تنگ نظر آیا تو دوسرے غیر آباد علاقہ پر آباد ہو گئے۔ حتیٰ کہ نسل انسانی مختلف علاقوں، مختلف ملکوں اور مختلف خطوں میں آباد ہو گئی اور جغرافیائی اور طبعی حالات کی تبدیلیوں کی وجہ سے اصل زبان کا لب و لہجہ بدلتا رہا۔ نئی نئی ضرورتوں سے نئے نئے الفاظ وضع ہوتے رہے۔ نئے تجربات زندگی نئے خیالات کی پیدائش کا باعث بنے۔ اور نئے خیالات اپنے اظہار کے لئے نت نئے الفاظ کے قالب تلاش کرتے رہے۔ اور اس طرح ایک زبان سے کئی زبانیں پیدا ہوئیں اور ہر زبان اپنی اپنی جگہ ارتقا کی منزلیں طے کرتے ہوئے نئے الفاظ کے ذخیرہ سے مالا مال ہوتی رہی اور یہ قدرتی عمل آج تک جاری ہے۔

زبان انسانی تہذیب و ترقی اور نوع انسان کی تاریخ کا ایک شعبہ ہے۔ زبانیں بھی انسان کی طرح منزل حیات کے مختلف ادوار میں سے گزرتی ہیں اور انسان کی طرح کُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ کے حکم ناطق کے ماتحت ہیں۔ پیدا ہوتی ہیں۔ پھر طفولیت کی منزل سے بلوغت کی منزل میں داخل ہوتی ہیں اور قدرتی اسباب سے مٹ بھی جاتی ہیں۔ سنسکرت آج کہیں نہیں بولی جاتی۔ یہی حال عبرانی، سریانی، قبطی اور ژند اوستائی زبان

ا ہے۔ خدا ہی جانتا ہے کہ کتنی زبانیں عالم وجود میں آئیں اور آخرکار نقش فنا بنے ہوئے اس جہاں فانی سے مٹ گئیں

اردو زبان پر نظر ڈالنے آج سے آٹھ نو سو سال پہلے کہیں اس کا وجود نہ تھا۔ محمود غزنوی کے ہندوستان پر بار بار حملہ آور ہونے سے فارسی اور بھاشا کا اختلاط شروع ہوا۔ کچھ عرصہ بعد شہاب الدین غوری نے لئے پتھورا پرتھی راج اپر فتح ہوئی پرتھی راج کے درباری شاعر چاند نے پرتھی راج راسا۔ لکھا جسے پڑھ کر حیرت ہوتی ہے کہ برج بھاشا نے فارسی عربی کا اثر کس قدر جلد اور کس قدر زیادہ قبول کر لیا۔

کل پروردگار۔ پیگام (پیغام) سرتان (سلطان) بات شاہ (بادشاہ) دیوان۔ خلک (خلق) عالم۔ حجرت (حضرت) ملک۔ مہربان (فرمان) سلام وغیرہ کئی فارسی عربی کے الفاظ اس ہندو شاعر کے کلام میں دخیل ہیں ؎

ہندوستان میں مسلمانوں کی سلطنت کی بنیاد قطب الدین ایبک کی تخت نشینی سے پڑی اسی خاندان کے آخری بادشاہ بلبن کے زمانہ (۱۲۶۶ء سے ۱۲۸۷ء) میں اردو کا پہلا شاعر امیر خسرو (سال وفات ۱۳۲۵ء) ہوا ہے۔ امیر خسرو کا تقریباً سارا کلام فارسی زبان میں ہے مگر اس کی کئی پہیلیاں، مکرنیاں، دوسخنے اور انمل بے جوڑ گیت اردو میں ہیں ؎ اور امیر خسرو کی ایک نظم جو خالق باری کے نام سے مشہور ہے اس طرح ہے کہ لفظ یا ایک مرکب فارسی میں ہے۔ تو اس کا ترجمہ اردو میں ساتھ ہی نظم کیا گیا ہے۔ مثلاً۔

بیا برادر آؤ رے بھائی
بنشین مادر بیٹھ ری مائی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ امیر خسرو کے زمانے میں اردو عوام کی زبان بن چکی تھی سکندر لودھی (۱۴۸۹ء تا ۱۵۱۷ء) کے زمانے میں بھگت کبیر (۱۴۴۰ء تا ۱۵۱۸ء) میں نے دوہے لکھے۔ زبان کا رنگ دیکھئے

دین گنوایو دنی سے دنی نہ آئیو ہات
پیر کلہاڑی ماریو گاپھل اپنے ہات

حاشیہ ؎ بحوالہ تاریخ ادب اردو (عسکری، تیسرا ایڈیشن مطبع نولکشور صفحہ ۴ و آب حیات، بار پانزدہم (شیخ مبارک علی لاہور) صفحہ ۱۵ و ۱۶۔

؎ آب حیات، پندرھواں ایڈیشن۔ شیخ مبارک علی لاہور۔ صفحہ ۱۷۔

کبیر مریہ مرائے ہے کیوں سووت سکھ چین
تو پچ نگارا سانس کا باجت ہے دن رین

بابر کے زمانے میں (۱۵۲۶ء سے ۱۵۳۰ء) گرونانک کے شبدوں کی شہرت تھی ایک دوہا دیکھئے

سانس ماس سب جیو تمہارا۔ تو ہے کھرا پیارا
نانک شاعر ایہو کہت ہے — سچے پروردگارا

اکبر کی صلح کل پالیسی کی وجہ سے زبان اردو نے اور ترقی کی شاہجہان (۱۶۲۸ء تا ۱۶۵۹ء) کے زمانے میں اردو نے اور وسعت پائی اور اردو نام پایا۔ اورنگ زیب (۱۶۵۹ء تا ۱۷۰۷ء) کے زمانے میں یہ زبان شمالی ہندوستان سے جنوبی ہندوستان، دکن میں جا پہنچی اور پھر تو اس زبان نے عام بول چال سے آگے قدم بڑھا کر تصنیف و تالیف پر بھی قبضہ کر لیا۔ مولانا آزاد لکھتے ہیں [1]

"تعجب ہوا کہ ایک بچہ شاہجہانی بازار میں پھرتا ہوا
ملے شعراء اسے اٹھالیں اور ملک سخن میں پال
کر پرورش کریں انجام کو یہاں تک نوبت پہنچے
کہ وہی ملک کی تصنیف و تالیف پر قابض ہو جائے"

انگریزی زبان کے اثر و نفوذ سے اردو زبان نے اور ترقی کی ہے۔ اور نئے الفاظ اور نئے خیالات سے زبان و ادب مالا مال ہوئے ہیں اور آج جب کہ اس زبان کی عمر زیادہ سے زیادہ چار سو سال سے زیادہ نہیں۔ ہم اس زبان پر فخر کرتے ہیں اور دنیا کے تمام متمدن اور مہذب زبانوں سے اس کا مقابلہ کر سکتے ہیں

زبان کے متعلق ان مختصر سے اشارات سے صرف یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ زبانیں قدرتی اسباب سے پیدا ہوتی ہیں اور پھر قدرتی اسباب سے اپنی ارتقا کی منازل طے کرتی رہتی ہیں۔

نیز اس سے یہ وضاحت بھی مطلوب تھی کہ زبان ایک قابل قدر عطیہ ایزدی ہے۔

یوں تو جو کچھ ہم منہ سے بولتے ہیں۔ لفظ کہلاتا ہے لیکن بعض الفاظ بامعنی ہوتے ہیں۔ بامعنی الفاظ کو ہم صرف و نحو کی اصطلاح میں کلمہ کہتے ہیں۔ اور بے معنی الفاظ کو مہمل۔ مہمل بے معنی ہونے کی وجہ سے

حاشیہ [1] دیباچہ آب حیات از آزاد

کلام میں کوئی حیثیت نہیں کیونکہ صرف کلمہ ہی کلام کی جان ہے۔ کلمہ یا اسم ہوتا ہے یا فعل ہوتا ہے یا حرف۔ اسم فعل اور حرف مل کر جملہ بناتے ہیں اور جملہ ہمارے مافی الضمیر کا ذریعہ اظہار یا ترجمان ہوتا ہے۔

اب ہم الفاظ و کلمات اپر پھر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ تاکہ دیکھیں کہ خود الفاظ کے اندر کیا کیا خوبیاں پنہاں ہوتی ہیں۔ الفاظ میں کیا حسن ہے کیا سحر ہے۔ اور کیا جادو ہے جس کی وجہ سے رسول اکرمؐ کی زبان مبارک سے یہ تعریف نکل کر۔ انّ من البیان لسحراً ہ

ا۔ ہر زبان میں کسی ایک چیز کو بیان کرنے کے لئے کئی کئی الفاظ ہوتے ہیں کسی ایک چیز کیفیت یا بات کو بیان کرنے کے لئے ذخیرہ الفاظ کا زیادہ ہونا وسعت زبان کی دلیل ہے۔ زبان جوں جوں اپنی منازل حیات طے کرتی جاتی ہے۔ الفاظ کے خزانے میں اضافہ کرتی جاتی ہے عربی زبان میں ذخیرہ الفاظ اس قدر زیادہ ہے کہ طویل قصیدوں میں بھی شاعروں نے ایک قافیہ دوبارہ استعمال نہیں کیا۔ اور ایک ہی مطلب یا مفہوم کو بار بار دہرایا ہے۔ مگر ہر بار الفاظ نئے استعمال کئے ہیں۔ انگریزی زبان میں بھی ذخیرہ الفاظ کا تقریباً یہی حال ہے۔ فارسی زبان میں چونکہ عربی الفاظ سے کام لیا جا سکتا ہے۔ اسلئے فارسی زبان بھی اپنی تنگ دامانی کی شکایت نہیں کرتی۔ اردو زبان کو فارسی پر بھی ایک گونہ تفوق حاصل ہے۔ اور وہ اس طرح سے کہ اردو زبان میں فارسی عربی اور ہندی کے الفاظ ہیں اور بعض انگریزی کے الفاظ اس طرح سے سما سکتے ہیں کہ ثقالت ذرا بھی نہیں کھٹکتی۔ اردو کا دامن بہت وسیع ہے اور اس کے الفاظ کا ذخیرہ روز بروز بڑھ رہا ہے۔

ذخیرہ الفاظ کی کثرت سے کلام میں یہ حسن پیدا ہوتا ہے کہ ہم ایک ہی بات کو مختلف لفظوں میں استعمال کرتے ہیں تکرار الفاظ کی ضرورت نہیں پڑتی اور اگر ایک ہی بات انہی الفاظ میں بار بار دہرائی جائے تو اس کی تاثیر زائل ہو جاتی ہے اور سامعین کی طبائع میں اس سے تکدر پیدا ہوتا ہے ؎

؎ مکرر گرچہ سحر آمیز باشد
طبیعت را ملال انگیز باشد

ذخیرہ الفاظ کی وسعت سے کلام میں دوسرا حسن یہ پیدا ہو سکتا ہے۔ کہ ہم کسی چیز کی ہوبہو تصویر لفظوں میں کھینچ سکتے ہیں اسی وجہ سے شاعری کو مجسمہ سازی، سنگتراشی، تصویر کشی وغیرہ فنون لطیفہ پر برتری حاصل ہے۔ انگریزی زبان کے شاعر سوودے نے آبِ لڈور کی روانی کا نقشہ الفاظ میں ایسا کھینچا ہے کہ کوئی نقاش یا مصور نہ کھینچ سکے اکبر الہ آبادی نے اس نظم کا اردو نظم میں ترجمہ کیا ہے اور فصاحت کا دریا بہا دیا

ہے۔ قصہ مختصر الفاظ کی کثرت ہی ہماری شاعری اور خطابت کے چمن کو سدا بہار بناتی ہے۔ اور انہیں نت نئی طراوت اور حلاوت بخشتی ہے۔

۲۔ الفاظ کی خوبی یہ ہے۔ کہ بیش الفاظ دو یا دو سے زیادہ معنوں کے حامل ہوتے ہیں مثلاً آب کے معنی پانی بھی ہے اور چمک بھی کل کے معنی آنے والا یا گزرا ہوا دن بھی ہے۔ شکیب بھی ہے اور قرار بھی ہے۔ کان گوش اور معدن دونوں معنوں کا حامل ہے۔ الفاظ کی اس خوبی سے کلام کے حسن کو دوبالا کیا جا سکتا ہے۔ ایسے الفاظ کو یکجا لانا جو شکل و صورت سے ایک جیسے ہوں مگر معنوں میں مختلف اصطلاح میں صنعت تجنیس کہلاتا ہے۔ تجنیس کی کئی قسمیں ہیں اگر دونوں لفظ ہر لحاظ سے ایک جیسے ہوں صرف معنوں میں مختلف ہوں تو یہ تجنیس تام ہے مثلاً کل شکیب اور قرار کے معنوں میں استعمال کرنا۔ اگر دونوں لفظوں میں صرف ایک حرف کی کمی یا بیشی ہو تو یہ تجنیس زائد و ناقص کہلاتی ہے۔ مثلاً بات اور نبات کو یا بال اور زوال کو ایک ہی جملہ یا شعر میں لانا۔ اگر دونوں الفاظ ہر لحاظ سے مشابہ ہیں لیکن صرف حرکات و سکنات کا فرق ہے تو یہ تجنیس محرف کہلاتی ہے مثلاً بَیر (ایک میوہ) اور بَیر (دشمنی) تجنیس کی دوسری قسموں کا بیان آگے آئے گا۔

الفاظ کی اس خوبی سے کلام میں ایک اور صنعت پیدا کی جا سکتی ہے۔ یعنی ایک ایسا لفظ کلام میں لانا جس کے دو معنی ہوں سننے والے کی توجہ معنی قریب کی طرف جائے۔ مگر قائل کی مراد معنی بعید ہوں اس صنعت کا نام ایہام ہے۔ جو بہت مشہور ہے اور بہت بدنام ہو چکی ہے۔

۳۔ ہر زبان کے ذخیرہ میں ایسے بے شمار الفاظ ہوتے ہیں جو ایک دوسرے کے متضاد ہوتے ہیں الفاظ کے اس تطابق اور تضاد سے بھی کلام میں ایک خاص دلکشی پیدا کی جاتی ہے۔ اگر کلام میں ایسے الفاظ کو ایک خاص سلیقہ سے جمع کیا جائے جو متضاد ہوں تو اس صنعت کو صنعت طباق یا تضاد کہتے ہیں غالب نے اس صنعت کے پیدا کرنے میں کمال فن کا اظہار کیا ہے۔ کلام غالب میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔ مثلاً

(۱) دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے
ہے ترے تیر کا پیکان عزیز

(۲) بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

اس صنعت کی اور بہت سی مثالیں آ گے صفحات میں دیکھیں گے۔

(۴) بعض اوقات الفاظ کی تکرار معنوں میں وسعت، لطف اور تاکید و تائید پیدا کرتی ہیں وہاں الفاظ کا دوبارہ لانا ہی خوبیٔ کلام کا باعث ہوتا ہے۔ اس خوبی کا نام علم بدیع کی زبان میں صنعتِ تکرار ہے مثلاً

(۱) ہوتے ہوتے جان دوبھر ہو گئی
بڑھتے بڑھتے بڑھ گئی بیماریاں

(۲) طبیعت کو ہوگا قلق چند روز
سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائے گی

(۵) الفاظ کی ایک خوبی یہ ہے کہ ایک لفظ یا مادہ سے کئی اور الفاظ بنائے جا سکتے ہیں۔ مثلاً علم سے عالم، معلم، متعلم، تعلیم، معلوم وغیرہ۔ بعض اوقات سابقوں اور لاحقوں کی مدد سے نئے لفظ بنائے جاتے۔ صرف ایک لفظ کی گردان سے نئے الفاظ بنتے ہیں۔ ایک مصدر سے کئی الفاظ مشتق ہوتے ہیں الفاظ کی یہ صنعت بھی کلام میں ایک خاص حسن پیدا کر دیتی ہے۔ اگر کلام میں ایسے الفاظ ایک جا جمع ہوں جو ایک ہی مصدر سے مشتق ہوں یا ایک ہی مادّے سے بنے ہوں۔ تو علم بدیع میں اس صنعت کا نام صنعت اشتقاق ہوتا ہے۔

(۶) ہم وزن اور ہم قافیہ ہونا بھی الفاظ کی ایک خوبی ہے۔ وزن الفاظ کے حرکات وسکنات ترتیب اور تعداد وغیرہ کا ایک مجموعی نام ہے مثلاً حبیب، جمیل، شمیم اور نذیر ہم وزن الفاظ ہیں۔ ان میں حروف کی تعداد اور حروف کے اعراب ایک جیسے ہیں۔ مگر یہ الفاظ ہم قافیہ نہیں۔ حبیب کے ہم قافیہ رتیب نصیب، قریب وغیرہ ہیں۔ جمیل کے ہم قافیہ، جلیل، خلیل اور شکیل ہیں۔ شمیم کے ہم قافیہ الفاظ نسیم، زعیم اور نعیم وغیرہ ہیں نذیر کے ہم قافیہ الفاظ بشیر، امیر، اور فقیر وغیرہ ہیں ہم قافیہ الفاظ میں دیگر قیود کے علاوہ آخری حرف کا ایک ہونا ضروری ہے۔

ہماری شاعری کی ساری عمارت الفاظ کی اس خوبی پر قائم ہے۔ شعر کی دلکشی اور دلآویزی اسی وجہ سے ہے الفاظ کی یہی صنعت شعر کو موسیقی اور ترنم عطا کرتی ہے اور موسیقی اور ترنم سے محبت انسان کی فطرت میں ودیعت کی گئی ہے اس زمانے میں وزن اور قافیہ کی قیود سے آزاد ہو کر آزاد نظمیں لکھی گئی ہیں۔ مگر انہیں قبولیت عام کی سند نہیں مل سکتی۔ آزاد نظم اور نثر میں کوئی چیز مابہ الامتیاز

نہیں وزن اور قافیہ ہی نظم کو نثر پر فوقیت بخشتے ہیں۔

الفاظ کی اس خوبی سے صنعت ترصیع اور صنعت مسمّط پیدا ہوتی ہیں۔ صنعت ترصیع کو شاعر کی قوت طبع، قدرت کلام اور فنکارانہ مہارت کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ترصیع یہ ہے کہ دونوں مصرعوں کے تمام الفاظ ہم قافیہ ہوں اور مسمّط یا سجع یہ ہے کہ ہر مصرع کے دو حصے ہوں اور اس طرح شعر کے چار ٹکڑوں میں سے پہلے تین ٹکڑے ہم وزن ہوں اور ہم قافیہ ہوں اور چوتھا قافیہ اصل غزل یا قصیدہ کا ہو۔ غالب کا صنعت ترصیع میں ایک شعر ایسا ہے جسے فصاحت اور بلاغت کی تقریباً تمام کتابوں میں بطور نظیر یا مثال کے پیش کیا گیا ہے۔

وہ شعر یہ ہے:-

۱	۲	۳	۴	۵	۶
تیرا	انداز سخن	شانہ	زلف	الہام	
تیری	رفتار	قلم	جنبش	بال	جبریل

غالب کا یہ شعر الفاظ کے حسن انتخاب کی وجہ سے سحر بن گیا ہے۔ اس کی نظیر کسی اور شاعر کے کلام میں مشکل سے ملے گی الا ماشاء اللہ۔ اب صنعت مسمّط میں غالب کا ہی ایک شعر اور دیکھیے:-

جب وہ جمال دلفروز صورتِ مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

۷۔ بعض الفاظ اپنے لغوی معنوں کے علاوہ اور معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مثلاً شیر ایک مشہور درندہ کا نام ہے۔ اور ہم کسی بہادر شخص کو بھی شیر کہتے ہیں۔ یہاں لفظ شیر اپنے مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے مثلاً:-

کس شیر کی آمد ہے کہ رن کانپ رہا ہے
رن ایک طرف چرخِ کہن کانپ رہا ہے

اس شعر میں لفظ شیر اپنے حقیقی معنوں میں استعمال نہیں ہوا مجازی معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ الفاظ کے ان حقیقی اور مجازی معنوں نے علم بیان میں بہت وسعت پیدا کی ہے۔ الفاظ کی اس خوبی نے تشبیہ و استعارہ، مجاز مرسل اور کنایہ کی مختلف صورتوں میں ایسے ایسے جلوے دکھائے ہیں کہ بےاختیار منہ سے

واہ وا۔ سبحان اللہ نکل جاتا ہے۔

(۸) بعض الفاظ اپنے حقیقی معنوں کے علاوہ کسی اور مشہور بات۔ قصہ۔ واقعہ۔ شعر یا آیت وغیرہ کی طرف بھی اشارہ کرتے ہیں۔ مثلاً پانی کے سیلاب کی زیادتی یا تباہی کو ظاہر کرتا ہو۔ تو ہم کہتے ہیں۔ سیلاب کیا تھا۔ طوفانِ نوح تھا۔ اور طوفانِ نوح سے وہ تمام نقشہ آنکھوں کے سامنے آجاتا ہے۔ جو ہم نے پڑھا یا سُنا ہوتا ہے۔ الفاظ کی اس خوبی سے ایک تو یہ فائدہ ہے۔ کہ ہم اپنے مفہوم کو زیادہ دلنشیں انداز سے بیان کر سکتے ہیں۔ اور دوسرا فائدہ کلام کا مختصر ہونا ہے۔ اختصار کلام بھی اپنے موقع پر کلام کا ایک بڑا وصف ہے۔ علم بدیع میں الفاظ کی اس خوبی سے دو صنایع بدایع پیدا ہوئے۔ صنعتِ تلمیح اور صنعت ایراد المثل۔

صنعتِ تلمیح ے کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب
آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہ طورؔ کی

ایراد المثل ے دہانِ یار سے غنچے کو دعوے
مثل سچ ہے کہ چھوٹا منہ بڑی بات

(۹) اُردو، فارسی اور عربی حروف میں ایک خاص صفت جو انہی زبانوں سے مخصوص ہے یہ ہے کہ حروف کے ساتھ آحاد، عشرات اور مآت کے اعداد بھی منسوب ہیں۔ ان حروف و اعداد کی مقررہ صورتیں یہ ہیں :-

ا	ب	ج	د	ہ	و	ز	ح	ط	ی	ک	ل	م	ن
۱	۲	۳	۴	۵	۶	۷	۸	۹	۱۰	۲۰	۳۰	۴۰	۵۰

س	ع	ف	ص	ق	ر	ش	ت	ث	خ	ذ
۶۰	۷۰	۸۰	۹۰	۱۰۰	۲۰۰	۳۰۰	۴۰۰	۵۰۰	۶۰۰	۷۰۰

ض	ظ	غ
۸۰۰	۹۰۰	۱۰۰۰

حروف کی اس صفت سے صنعت تاریخ حاصل ہوتی ہے۔ یعنی کسی شخص کی تاریخ پیدائش۔ تاریخ وفات، کسی بچے کا تاریخی نام، کسی عمارت، مسجد یا کتاب وغیرہ کی تکمیل کی تاریخ الفاظ سے حاصل کی جاتی ہے۔ مثلاً ایک کتاب کی تاریخ طباعت یہ ہے۔

حضرت صوفیؔ نے لکھی یہ کتاب مدحِ حضرت میں عجب نادر غریب

قطعۂ تاریخ لکھنے کے لئے ۔۔۔ مجھ کو بھی ایسا ہوا جائے نصیب
تب ہوئی تاریخ کی مجھ کو تلاش ۔۔۔ ہاتف غیبی نے آ میرے قریب
مصرعۂ تاریخ یوں موزوں کیا ۔۔۔ "نعت محبوب خدا ہے یہ عجیب"

"نعت محبوب خدا ہے یہ عجیب" سے بارہ سو اٹھانوے بے کم و کاست حاصل ہوتے ہیں ۔

(۱۰) الفاظ کی ایک اور خوبی ان کا صوتی حسن اور مترنم ہونا بھی ہے ایک ماہر فن کار کے ہاتھوں میں الفاظ ستار کے تاروں ۔ یا سارنگی کے پردوں کی طرح ہیں ۔ جس طرح ستار کے تاروں کو ایک خاص اصول اور ایک خاص قاعدے سے چھیڑیں ۔ تو اُن سے نغمہ پیدا ہوتا ہے بلکہ اسی طرح موزوں الفاظ کی بندش سے بھی ہر نغمہ اور ہر راگ پیدا کیا جا سکتا ہے ۔ الفاظ کی اس نغمگی سے علم عروض کے قواعد مرتب کئے گئے مثنوی ، رباعی ، غزل اور قصیدہ کہنے کے لئے الگ الگ بحور تجویز کئے گئے ۔ اور ایسے اصول وضع کئے گئے جو آج تک ہمارے شاعروں کو مشعل راہ کا کام دے رہے ہیں ۔

اپنے صوتی اثرات کی بنا پر الفاظ نرم بھی ہوتے ہیں اور سخت بھی ۔ الفاظ میں سوز و گداز بھی ہوتا ہے اور خشونت و سنگینی بھی ۔ الفاظ میں نزاکت بھی ہوتی ہے اور صلابت بھی ۔ الفاظ کی اس سختی اور نرمی ، نزاکت اور صلابت سے ہمارے اُن شاعروں نے جو ماہر فن کہلاتے ہیں ۔ مثنوی ، غزل ، اور قصیدہ وغیرہ اصناف سخن کے لئے الفاظ بھی تقریباً مقرر کئے ہیں ۔ یا الفاظ کے انتخاب کو منضبط بنا دیا ہے ۔ غزل کے الفاظ نرم ، سوز و گداز سے پر ، شیریں اور ملائم ہوتے ہیں ۔ اس کے برعکس قصیدہ میں وہ الفاظ استعمال کئے جاتے ہیں ۔ جو شاندار پُرشکوہ ، اور مرعوب کن ہوں ۔ مثنوی میں ہر قسم کی منظر کشی اور ہر قسم کے واقعات بیان کئے جاتے ہیں ۔ اس لئے مثنوی کے مختلف حصوں میں الفاظ کی نوعیت بھی مختلف ہوتی ہے ۔ مرثیہ میں وصف تو شاندار الفاظ کا متقاضی ہوتا ہے مگر نوحہ پُرسوز الفاظ پر مشتمل ہوتا ہے ۔

میر و سودا کی غزلوں کا موازنہ کرتے ہوئے تمام تنقید نگار زیادہ تر اسی بات کو ہدف تنقید ٹھہراتے ہیں کہ سودا نے غزل میں غزل کی زبان استعمال نہیں کی ۔ بلکہ قصیدہ کے پُرشکوہ الفاظ کا غزل میں استعمال کیا ہے ۔ میر اور سودا کے یہ دو شعر دیکھئے جو متحد المضمون ہیں ۔ اور انداز بیان کے علاوہ الفاظ کے تفاوت پر غور کیجیے :

سودا : ۔۔۔ سودا کے جو بالیں پہ گیا شور قیامت ۔۔۔ خدام ادب بولے ابھی آنکھ لگی ہے ۔

میر ؎ سرہانے میر کے آہستہ بولو ابھی ٹک روتے روتے سو گیا ہے

اور انصاف کیجیے کہ شور، قیامت، بالیں اور خدام ادب، کیا یہ الفاظ اس مضمون کو ادا کرنے کے لئے موزوں ہیں؟

میر اور سودا کا ایک ایک اور شعر جس کا اس کتاب کے موضوع سے خاص تعلق ہے۔ سنئے۔ دونو بزرگ ایہام گوئی سے انکار کرتے ہیں۔ مگر دونو بزرگوں کے طرز انکار کو دیکھیے اور الفاظ کی موزونیت پر غور کیجیے:۔

سودا ؎ یکرنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا ئیں ہوں

میر ؎ کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں، ایہام بھی نہیں

الفاظ کی نزاکت اور صلابت، نرمی اور سختی، انکسار اور استکبار جانچنے کے لئے میر و سودا کا ایک ایک شعر اور دیکھئے:

سودا ؎ چمن میں صبح جو اُس جنگجو کا نام لیا
صبا نے تیغ کا موجِ رواں سے کام لیا

میر ؎ ہمارے آگے ترا جب کسی نے نام لیا
دلِ ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

ان مثالوں سے ہم یہ بات ذہن نشین کرنا چاہتے ہیں کہ نثر یا نظم میں، خطابت یا شاعری میں، الفاظ سے وہی کام لیا جاتا ہے جو مصور اپنے موقلم سے، سنگ تراش اپنے سنگ تراشی کے اوزار سے اور موسیقار ستار یا رباب کی تاروں سے کام لیتا ہے۔ اور جس طرح کسی غلط تار کو چھیڑنے سے نغمہ خارج از آہنگ ہو جاتا ہے اُسی طرح ایک نامناسب اور ناموزوں لفظ کے کلام میں داخل کرنے سے کلام بھی خارج از آہنگ ہو جاتا ہے۔ موزوں اور مناسب الفاظ کا انتخاب حسن کلام کے لئے ازبس ضروری ہے۔ اور مشق و مہارت کے علاوہ وقتِ نظر کا بھی طالب ہے ؎

بندش الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

آئیں اب ذرا شعر کی ماہیت پر غور کریں۔ شعر کسی خیال کو الفاظ میں ظاہر کرنے کا نام ہے۔ خیال کا اظہار نثر میں بھی کیا جا سکتا ہے۔ پھر نظم کی ضرورت کیوں پڑی؟ جو چیز سیدھے سادے جملوں میں ادا ہو سکے اس کے لئے شعر کیوں زیادہ موزوں خیال کیا جاتا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ شعر الفاظ کی موزونی۔ دلکشی اور بندش الفاظ کے ایک خاص مسحور کن انداز کی وجہ سے زیادہ دلپذیر اور پُر تاثیر ہوتا ہے۔ شعر کا اثر زیادہ گہرا اور دیرپا ہوتا ہے۔ جہاں خطابت کام نہیں دے سکتی۔ وہاں شعر کام آتا ہے۔ مغرب اور مشرق کے تمام نقاد اور زبان و ادب کے اُستاد شعر کی تاثیر کے قائل ہیں۔ اس لئے اس پر مزید بحث لاحاصل ہے۔

خیال اور الفاظ دونو لازم ملزوم ہیں۔ مولانا شبلی نعمانی اور مولانا حالیؔ دونو بزرگوں نے اپنے اپنے انداز میں خیال اور الفاظ کو ہی شعر کے اجزائے ترکیبی قرار دیا ہے۔ بلکہ مولانا حالی الفاظ کو خیال پر ترجیح دیتے ہیں۔

"ہم[1] یہ بات تسلیم کرتے ہیں کہ شاعری کا مدار جس قدر الفاظ پر ہے۔ اس قدر معانی پر نہیں۔ معانی کتنے ہی بلند اور لطیف ہوں۔ اگر عمدہ الفاظ میں بیان نہ کئے جائیں ہرگز دلوں میں گھر نہیں کر سکتے اور ایک مبتذل مضمون پاکیزہ الفاظ میں ادا ہونے سے قابل تحسین ہو سکتا ہے۔"

مولانا شبلی شعر العجم[2] حصہ چہارم کے باب اوّل میں "حسنِ الفاظ" کے عنوان کے تحت لکھتے ہیں:

"یہ ایک نہایت ضروری بحث ہے۔ اس لئے ہم اس کو تفصیل سے لکھتے ہیں۔ کتاب العمدہ میں باب فی اللفظ والمعنی ایک خاص عنوان قایم کیا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے۔ لفظ جسم ہے اور مضمون روح۔ دونو کا ارتباط باہم ایسا ہے۔ جیسا روح اور جسم کا ارتباط کہ وہ کمزور ہوگا۔ تو یہ بھی کمزور ہوگی پس اگر معنی میں نقص نہ ہو۔ اور لفظ میں ہو۔ تو شعر میں عیب سمجھا جائیگا۔ جس طرح لنگڑے یا لنجے میں روح موجود ہوتی ہے۔ لیکن بدن میں

حاشیہ [1] مقدمہ دیوان حالیؔ۔ (انشاپردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہے)

[2] (شعر العجم حصہ چہارم (مطبوعہ حاجی فرمان علی) صفحہ ۵۲

عیب ہوتا ہے - اسی طرح اگر لفظ اچھے ہوں لیکن مضمون اچھا نہ ہو تب بھی شعر خراب ہوگا - اور مضمون کی خرابی الفاظ پر بھی اثر کریگی - اگر مضمون بالکل لغو ہوا ور الفاظ اچھے ہوں - تو الفاظ بھی بیکار ہوں گے جیسے مردہ کا جسم کہ یوں دیکھنے میں سب کچھ سلامت ہے - لیکن درحقیقت کچھ بھی نہیں - اسی طرح مضمون گو اچھا ہو - لیکن الفاظ اگر بُرے ہیں تب بھی شعر بیکار ہوگا کہ روح بغیر جسم کے پائی نہیں جا سکتی ۔"

"اہل فن کے دو گروہ بن گئے ہیں - ایک لفظ کو ترجیح دیتا ہے اور اُس کی تمام تر کوشش الفاظ کے حُسن و خوبی پر مبذول ہوتی ہے - عرب کا اصلی انداز یہی ہے - بعض لوگ مضمون کو ترجیح دیتے ہیں اور الفاظ کی پروا نہیں کرتے - یہ ابن آلرومی اور متنبّی کا مسلک ہے ۔"

"لیکن زیادہ تر اہلِ فن کا یہی مذہب ہے کہ لفظ کو مضمون پر ترجیح ہے - وہ کہتے ہیں کہ مضمون تو سب پیدا کر سکتے ہیں لیکن شاعری کا معیارِ کمال یہی ہے کہ مضمون ادا کن الفاظ میں کیا گیا ہے - اور بندش کیسی ہے ۔"

"حقیقت یہ ہے کہ شاعری یا انشاپردازی کا مدار زیادہ تر الفاظ پر ہی ہے - گلستان کے جو خیالات اور مضامین ہیں - ایسے اچھوتے اور نادر نہیں لیکن الفاظ کی فصاحت اور ترتیب اور تناسب نے اُن میں سحر پیدا کر دیا ہے ۔"

انگلستان کے شہرۂ آفاق ادیب کارلائل نے شعر کی تعریف یُوں کی ہے کہ شاعری خیال کو مترنم الفاظ میں ڈھالنے کا نام ہے - جانسن کے نزدیک شاعری تخئیل اور الفاظ کی مدد سے مسرت اور صداقت کو یکجا کرنے کا نام ہے - کالرج شاعری کو سائنس کے متضاد قرار دیتے ہوئے جانسن سے صرف اتنا اختلاف رکھنے ظاہر کرتا ہے کہ شاعری کا کام سائنس کی طرح صداقت دریافت کرنا نہیں بلکہ شاعری کا کام صرف مسرت بخشنا ہے - مکالے ارسطو کے نظریے کا حامی ہے یعنی شاعری ایک قسم کی نقّالی ہے - اور بہترین نقّالی سے لذّت اندوز ہونا انسانی فطرت ہے - شیلے شعر و شاعری پر ایک طویل بحث کے بعد اس نتیجہ پر پہنچا کہ بہترین خیال کو بہترین الفاظ میں ادا کرنا شعر ہے ۔

متذکرہ بالا حوالوں سے ہم یہ واضح کرنا چاہتے ہیں کہ شعر میں الفاظ کو بہت اہمیت حاصل ہے اور بعض سخن سنج اسے خیال پر بھی ترجیح دیتے ہیں - ہماری تمام تنقید کا سرمایہ زیادہ تر لفظ کی صحت اور عدم صحت پر مشتمل ہے - اساتذہ کے کہنے ہوئے تذکرے اسی بحث سے پُر ہیں کہ فلاں شاعر نے فلاں لفظ

کا غلط استعمال کیا ہے۔ غالب کا کلکتے والا معرکہ جس کو حیات غالب کا ایک اہم واقعہ قرار دیا جاتا ہے۔
جس پر اس وقت کے علماء، فضلاء اور شعراء دو فریق مخالف بن کر میدان مباحثہ و مناظرہ میں کود پڑے
اور ایک دوسرے کی پگڑی اچھالنے کی کوشش کی۔ وہ ہنگامہ اور معرکہ اس ایک لفظ پر برپا ہوا تھا کہ
غالب نے اپنے ایک شعر میں ہمہ کا لفظ درست استعمال نہیں کیا۔

شعر

جزوی از عالمم و از ہمہ عالم بیشم
ہمچو موئی کہ بتاں را ز میاں برخیزد

غالب نے مثالیں دے دے کر واضح کیا کہ اس کا اقدام راستی پر مبنی ہے۔ مخالفین نے قتیل
و واقف کے حوالہ سے اس لفظ کے استعمال کو غلط ثابت کیا۔ غالب نے قتیل و واقف کو فارسی زبان
سے ناواقف کہا۔ اور ایران کے مسلم الثبوت شعرائے کلام سے سند پیش کی۔ اس معرکہ سے تمام اہل علم واقف
ہیں۔ اس لئے ہم اس کو تفصیل سے بیان کرنا تحصیل حاصل سمجھتے ہیں۔ مقصد اس کے ذکر سے یہ تھا کہ
شعر میں الفاظ خیال سے بھی اہم ہوتے ہیں۔ فیضی نے جو شاعر کی تعریف کی ہے۔ اس میں یہی لکھا ہے۔
کہ جب تمام عالم خواب راحت کے مزے لے رہا ہوتا ہے۔ شاعر پاکیزہ سے پاکیزہ تر اور لطیف
سے لطیف تر لفظ کی تلاش میں بیدار رہتا ہے۔

برای پاکیٔ لفظی شبی بروز آرد
کہ مرغ و ماہی باشند خفتہ او بیدار

غالب نے جہاں اپنے خیال اور مضمون کی تعریف کی ہے وہاں اُسے اپنے کلام کے ایک ایک لفظ
بلکہ ایک ایک حرف پر بھی ناز ہے۔

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالب مری گفتار میں آئے

اور

در تہ ہر حرف غالب چیدہ ام میخانۂ
تاز دیوانم کہ سرمست سخن خواہد شدن

غالب کے اور بھی بہت سے اشعار ایسے ہیں۔ جو کلام غالب کی لفظی خوبیوں کی طرف اشارہ

رتے ہیں۔ جو آپ اس کتاب کے باب چہارم میں دیکھیں گے۔ اگلے دو ابواب میں ہم فارسی اور اردو شاعری کے مختلف ادوار کے نمائندہ شاعروں کے کلام میں محاسن لفظی یا صنایع بدایع پر نظر ڈالیں گے۔ اور چوتھے باب میں غالبؔ کی صنعت گری پر تبصرہ کریں گے ؛

باب دوم

فارسی شاعری میں صنایع بدایع

فارسی ادب کے تقریباً تمام تذکرہ نگار اور مورّخ عباس مروزی کو فارسی کا قدیم ترین شاعر قرار دیتے ہیں ۔جس نے خلیفہ مامون کے مرو میں تشریف لانے پر ایک طویل مدحیہ قصیدہ کہا جس کے چند اشعار یہ ہیں :۔

ای رسانیدہ بدولت فرق خود تا فرقدین

گسترانیدہ بجود و فضل در عالم یدین

مر خلافت را تو شائستہ چو مردم دیدہ را

دین یزداں را تو بایستہ چو رُخ را ہر دو عین

کس بدیں منوال پیش از من چنیں شعرے نگفت

مر زبان پارسی را ہست تا ایں نوع بین ،

لیک زاں گفتم من ایں مدحت ترا تا ایں لغت

گیرد از مدح و ثنای حضرت تو زیب و زین

یہ قصیدہ اپنے بحر اور قوافی کے لحاظ سے ایک منفرد حیثیت رکھتا ہے ۔ قوافی کی ندرت

اور تشبیہ کی جدت کے علاوہ اس قصیدہ میں صنایع بدایع کی بھی کثرت ہے۔ علامہ محمد خاں قزوینی نے اس قصیدہ کو عباس مروزی سے منسوب کئے جانے اور اسے فارسی زبان کا پہلا شعر قرار دینے کو شک کی نگاہ سے دیکھا ہے[1] ان کے خیال میں یہ قصیدہ اس قدر مکمل ہے کہ خلیفہ مامون کے زمانے کے کسی فارسی شاعر سے اتنے اعلیٰ قصیدے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ کیونکہ فارسی زبان میں اُس وقت تک اتنی وسعت ہی نہیں تھی۔ ہمیں اس بحث میں الجھنے کی ضرورت نہیں۔ ہم یہ ظاہر کرنا چاہتے ہیں کہ اگر یہی قصیدہ، واقعی فارسی کا قدیم ترین قصیدہ ہے۔ یا دوسرے الفاظ میں اگر عباس مروزی ہی فارسی کا پہلا شاعر ہے اور یہ قصیدہ اُسی نے لکھا ہے تو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ فارسی شاعری کی ابتداء سے ہی صنعت گری یعنی صنایع بدایع فن شعر میں داخل ہو چکے تھے۔

عباس مروزی کے بعد ابو عبد جعفر بن محمد رودکی کو سب مورّخ بالاتفاق فارسی کا پہلا صاحب دیوان شاعر مانتے ہیں۔ اُس کے ہم عصر شاعروں نے اس کی استادی کا اعتراف کیا ہے اور بعد میں آنے والے شعراء نے بھی رودکی کا نام احترام سے لیا ہے۔ نظامی عروضی سمرقندی نے اپنے چہار مقالہ میں رودکی کا ذکر کرتے ہوئے اس کے ایک قصیدہ کے چند اشعار نقل کئے ہیں۔ جن میں رودکی نے امیر ابو نصر بن احمد سامانی کو ہرات سے بخارا واپس چلنے پر اکسایا تھا۔ اور امیر پر اس قصیدے کے اشعار کا ایسا اثر ہوا کہ اُسی وقت بخارا کو روانہ ہو گیا۔ صاحب چہار مقالہ کا بیان ہے کہ اس قصیدے کا آج تک کوئی جواب نہیں لکھ سکا اور اس حکایت کے آخر میں رودکی کا ایک شعر نقل کرتے ہیں۔

آفرین و مدح سود آید ہمی
گر بگنج اندر زیاں آید ہمی

اور پھر لکھتے ہیں کہ اس شعر میں صنعت گری (صنایع بدیع) کی سات قسمیں ہیں۔ اوّل مطابق۔ دوم متضاد۔ سوم مردّف۔ چہارم بیان مساوات۔ پنجم عذوبت، ششم فصاحت، اور ہفتم جزالت۔

اگر ہم رودکی کو فارسی کا پہلا شاعر بزرگ مان لیں تو اس صورت میں بھی ہمیں یہی تسلیم کرنا

حاشیہ ۱:- تفصیل کے لئے دیکھو۔ بست مقالہ قزوینی۔ اولین شعر بعد از اسلام

پڑے گا کہ صنایع بدایع روزِ اوّل سے ہی فارسی شاعری کی گھٹی میں پڑے ہوئے ہیں مولانا شبلی نے شعر العجم میں رودکی کی شاعری کا عام انداز واقعہ نگاری، پند و نصیحت، اور حسن تاثیر قرار دیا ہے۔ مضامین کے لحاظ سے اُس کی شاعری کا دائرہ وسیع بتایا ہے اور اس کے عام مضامین میں واقعہ نگاری عشق و نعت، پند و نصیحت، مدح و ثنا اور صنایع بدایع کو شامل کیا ہے[1]۔

رودکی کے بعد فارسی کا مشہور شاعر دقیقی ہے۔

دقیقی کی شہرت کا بڑا سبب یہ ہے کہ اس نے امیر نوح بن منصور کے حکم سے شاہنامہ لکھنا شروع کیا تھا۔ کوئی ہزار شعر کہہ چکا تو پیغام اجل آگیا۔

اور وہ شاہنامہ کو مکمل نہ کر سکا۔ فردوسی نے دقیقی کے اشعار شاہنامہ میں شامل کر لیے اور شاہنامہ مکمل کیا۔ دقیقی نے قصائد بھی لکھے ہیں۔ اُس کا ایک مشہور قصیدہ تذکرہ نگاروں نے کُلاً یا جزوا نقل کیا ہے۔ جس کے مطالعہ سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ دقیقی کے مدحیہ کلام میں صنایع بدایع موجود ہیں۔ اُس قصیدہ کے چند اشعار دیکھیے۔

۱۔ برافگن اے صنم ابر بہشتی	زمیں را خلعت اُردی بہشتی
۲۔ بہشت عدن را گلزار ماند	درخت آراستہ حور بہشتی
۳۔ جہاں طاؤس گونہ گشت و دیدار	بجائے نرمی و جائے درشتی
۴۔ زگل بوی گلاب آید بدینساں	کہ پنداری گل اندر گل سرشتی
۵۔ دقیقی چار خصلت برگزیدہ است	بگیتی از ہمہ خوبی و زشتی
۶۔ لب یاقوت رنگ و نالہ چنگ	مئ خوش رنگ و دین زردہشتی

ان پانچ اشعار میں بھی صنعت تجنیس، صنعت مراعات النظیر، صنعت طباق یا تضاد، صنعت مسمط کی مثالیں ہیں۔

سامانیوں کے زوال سے غزنویوں کو عروج حاصل ہونا شروع ہوا۔ سلطان محمود غزنوی اس خاندان کا سب سے طاقت ور اور زبردست بادشاہ ہوا۔ جنگ جو ہونے کے باوجود یہ سلطان بڑا ہی علم پرور اور عالم نواز تھا۔ فردوسی نے اسی سلطان کے زمانے میں شاہنامہ مکمل کیا۔ شاہنامہ کے

حاشیہ:۔ شعر العجم حصہ اول، شیخ مبارک علی لاہور ۱۹۴۹ء، صفحہ ۲۸

محاسن بیان کرنے کے لئے ایک علیحدہ دفتر درکار ہے۔ ہمارے لئے فقط اتنا جاننا ہی کافی ہے کہ شاہنامہ میں صنایع بدایع کا تکلف بہت کم کیا گیا ہے مگر فردوسی کے ہم عصر شاعروں کے کلام میں صنعت گری کی کافی مثالیں موجود ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے۔ وہ صنایع بدایع کو عمداً کلام میں لاتے رہے ہیں۔ بلاغت کی اکثر کتابوں میں صنایع بدایع کی توضیح کرتے۔ شاہنامہ کے کئی شعروں کو مثال کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔ خصوصاً لف و نشر مرتب اور مبالغہ کے لئے فردوسی کے یہ اشعار ہر ایک کو یاد ہوں گے۔

ا۔ لف و نشر

(۱) بروز نبرد آں یل ارجمند — بہ شمشیر و خنجر بگرز و کمند

(۲) برید و درید و شکست و بہ بست — یلاں را سر و سینہ و پا و دست

ب۔ مبالغہ

زسم ستوراں دراں پہن دشت — زمیں شش شد و آسماں گشت ہشت

عنصری محمود غزنوی کے دربار کا ملک الشعراء تھا۔ عنصری کے اشعار کا بہترین حصہ اس کے قصائد ہیں اور عنصری نے اکثر قصیدوں میں ایسا کمال دکھایا ہے کہ آج تک تمام شاعر، ادیب اور تنقید نگار اس کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔ منوچہری جو خود بھی بڑا باکمال شاعر تھا اور عنصری کا ہم عصر، اس نے عنصری کی مدح میں اشعار لکھے ہیں ان میں سے دو شعر سنیئے۔

اوستاد اوستادان زمانہ عنصری
عنصرش بے عیب و دل بے غش و دینش بے فتن
شعر او چوں طبع او ہم بے تکلف ہم بدیع
طبع او چوں شعر او ہم بالطافت ہم حسن

عنصری کے ایک قصیدہ کے کچھ اشعار ہم یہاں نقل کرتے ہیں دیکھئے کہ ان چند اشعار میں صنایع بدایع کی کتنی کثرت ہے۔

(۱) چہ چیز است رخسارہ و زلف دلبر
گل مشک بوی و شب روز پرور

(صنعت جمع و تفریق، صنعت لف و نشر مرتب)

(۲) گل اندر شده زیر زرستہ سنبل ؛
شب اندر شده زیر خورشید انور (صنعت تقسیم)

(۳) بما تا که خورشید رنگ لبش را
به زرد کی بخشد بیاقوت احمر، (صنعت حسن التعلیل)

(۴) ز رنگ رخش پر گل سرخ مجلس
ز عکس لبش پر ز لعل سا غر... (حسن التعلیل اور مقابلہ)

(۵) نکوتر ز روشن شب تیره زلفش
اگر چند روشن ز تیره نکوتر (رد العجز علی الصدر)

(۶) بماه منورش مانند ه کردم
مرا روز شب کرد ماه منور، (تضاد یا طباق)

(۷) جهاندار محمود کاندر محامد
یکی عالم است از کفایت مصور (اشتقاق)

(۸) ایا زبردست تو هرچ آں مجبّر
ایا زیر قدر تو هرچ آں مقدّر (اشتقاق)

(۹، ۱۰) تو آنی که زرین شود کشته تو
به پیش خدای جهان روز محشر
که زرین بود روئیش و مانده باشد
ز پیکان تو استخوان هاش پر زر (حسن التعلیل)

(۱۱) بداں تیغ رنگ آتش و آب چهره
نه آب و نه آتش هم آب و هم آتش (تعجب، رجوع ۔

(۱۲) درفشی است گوئی بمینا منقش (مراعات النظیر)
پرندی گوئی بلور مشجر، (تنسیق الصفات)

(۱۳) شگفت آید از مرکب تو خرد را

کش از باد طبع است از خاک منظر (تعجب اور مراعات النظیر)

(۱۴) چو وہم اندر آید بہ ہنجار بے راہ

چو روز اندر آید بہ پہنای بے در (جدت تشبیہ)

(۱۵) نہ جستن کند کم ز دریا بدریا

نہ منزل کند کم ز کشور بکشور (ترصیع اور تنسیق الصفات)

یہ قصیدہ کافی طویل ہے اور اس کے تقریباً ہر شعر میں صنایع بدایع کی مختلف اقسام میں سے کوئی نہ کوئی قسم ضرور موجود ہے۔ جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ عنصری کے کلام میں صنایع بدایع کثرت سے استعمال میں لائے گئے ہیں۔

مولانا شبلی شعر العجم جلد اول میں عنصری کے کلام پر رائے زنی کرتے ہوئے فرماتے ہیں :-
"صنایع بدایع کا۔ یہ بدعت عنصری سے پہلے شروع ہو چکی تھی لیکن خال خال تھی اور اس قدر نمایاں نہ تھی کہ لوگوں کا خیال اُس طرف رجوع ہوتا۔ عنصری نے اکثر صنعتیں مثلاً لف و نشر، ترصیع، تقسیم، سوال و جواب، کثرت سے برتیں اور چونکہ بعض صنعتیں نہایت خوبی سے استعمال کیں۔ اور شعرا نے بھی تقلید کی۔ چنانچہ ترصیع یعنی دونوں مصرعوں میں تمام الفاظ کا باہم ہم وزن یا ہم قافیہ ہونا اس قدر عام ہوا کہ قدما کے اخیر دور یعنی ساتویں صدی تک تمام قصاید اسی انداز پر لکھے جاتے تھے اور فی صدی آسی شعروں میں یہ صنعت پائی جاتی تھی۔"

غزنوی دور کا دوسرا بڑا شاعر منوچہری ہے۔ منوچہری کو عربی مضامین اور عربی شاعری سے خاص لگاؤ تھا۔ اور وہ عربی زبان اور عربی لغت پر خوب حاوی تھا۔ اُس نے فارسی شاعری میں موٹے موٹے عربی الفاظ اور ثقیل عربی تراکیب داخل کی ہیں۔ اُس کے اکثر اشعار صنعت ملمع میں ہیں۔ یعنی ایک مصرع عربی کا اور دوسرا فارسی کا۔ یا پہلا فارسی کا اور دوسرا مصرع عربی کا۔ مثلاً ایک قصیدے کا مطلع یہ ہے :-

ملامہ علی دار اُمّ الکواعب

بتان سیہ چشم عنبر ذوائب ؛

فارسی شاعری پر منوچہری کا یہ احسان ہے کہ اُس نے عربی الفاظ عربی تشبیہات اور عربی استعارات سے فارسی زبان کو مالا مال کر دیا۔ اگرچہ اُس کے قصائد ندرت تشبیہات اور شکوہ الفاظ کے لئے زیادہ مشہور ہیں۔ تاہم صنایع بدایع سے اس کا کلام خالی نہیں ہے۔ اُس کے ایک قصیدے کے چند اشعار دیکھئے۔ اور ان کے صنایع بدایع پر نظر ڈالئے۔ یہ مشہور قصیدہ ہے جو کہ "شبی گیسو فرو ہشتہ بدامن" سے شروع ہوتا ہے۔

(۱) شبی چو چاہ بیژن تنگ و تاریک
چو بیژن درمیان چاہ زدمن (صنعت تلمیح اور تکرار اور عکس)

(۲) ثریا چو منیژہ بر سر چاہ
دو چشم من برا دچوں چشم بیژن (تلمیح)

(۳) برآمد باٹے از اقصاے بابل
ہبو بش خارہ در و بارہ افگن (تجنیس مضارع)

(۴) خروشی برکشیدی تند تندر
کہ موئ مردماں کردی چو سوزن (تجنیس زاید و ناقص)

(۵) تو گفتی نای رویئن ہر زمانی
بگوش اندر دمیدی یک دمیدن (اشتقاق)

(۶، ۷، ۸) مرا در زیر راں اندر کمیتے
کشیدہ نی و سرکش نی و توسن
عناں بر گردن سرخش فگندہ
چو دو مار سیہ بر شاخ چندن
دُمش چو تافتہ دُم بریشم (تنسیق الصفات)
سمش چوں نا آہن و فولاد بادن

محمود غزنوی کے دربار کے مشہور شاعروں میں سے ایک ابوالحسن علی بن جولوغ متخلص بہ فرخی بھی ہے۔ فرخی کو قدرت نے ذوق سلیم، فطری صلاحیت اور دلکش آواز سے خوب نوازا تھا۔ فرخی چنگ بھی

خوب بجاتا تھا۔ اور اپنے اشعار دلکش ترنم سے پڑھتا تھا۔ اسی وجہ سے محمود اسے بڑا عزیز رکھتا تھا فرخی نے خود بھی بادشاہ کی اس نوازش پر فخر کیا ہے۔ چنانچہ کہتا ہے :۔

شاہ گیتی مرا گرامی داشت   نام من داشت روز و شب بزبان
باز خواندی مرا زوقت بوقت   باز جستی مرا زمان بزمان ،
گاہ گفتی بیا و رود بزن   گاہ گفتی بیا و شعر بخوان

فرخی نے بڑے شاندار قصائد لکھے ہیں اور سب قصاید میں تشبیہات، استعارات، منظرکشی اور حسن بیان کے ساتھ ساتھ صنایع بدایع بھی پوری آب وتاب کے ساتھ موجود ہیں۔ جو قصیدہ فرخی نے ابوالمظفر شاہ کے لئے لکھا ہے اس میں صنایع بدایع کے التزام کی طرف خود اشارہ کرتا ہے۔

با کاروان حُلّہ بر فتم ز سیستان ،
با حلّہ تنیدہ ز دل بافتہ زجاں
با حلّہ فریشم ترکیب او سخن
با حلّہ و نگار گر نقش او زفاں
ہر تار او برنج برآوردہ از ضمیر ،
ہر پود او بجہد جدا کردہ از رواں
از ہر صنایعی کہ بخواہی براو اثر
وز ہر بدایعی کہ بخواہی براو نشاں

فرخی کے قصائد کی نقل کر کے اُن میں سے صنایع بدایع کی نشان دہی کرنا کوئی ایسا مشکل کام نہیں مگر ہم مضمون کی طوالت کے خوف سے فرخی کے انہی اشعار پر اکتفا کرتے ہیں۔ غزنوی دور کے شاعروں کا کلام دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس دور میں بھی صنایع بدایع کا سکہ خوب چلتا تھا چنانچہ[1] مولانا شبلی فرخی کے ذکر میں لکھتے ہیں۔ "صنایع بدایع عارض سخن کے داغ ہیں تاہم چونکہ اُس زمانہ میں اس کا رواج عام ہو گیا تھا۔ فرخی کے کلام میں بھی یہ داغ پائے جاتے ہیں۔ لیکن چنداں بدنما معلوم

حاشیہ۔ شعرالعجم جلد اول : مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹(۲) صفحہ ۷۰

نہیں ہوتے "۔

غزنویوں کے بعد سلجوقیوں کا زمانہ آیا۔ ایرانی تاریخ کا یہ سنہری دور ہے۔ اور ادبی لحاظ سے بھی اس دور کی اہمیت گذشتہ ادوار سے بہت زیادہ ہے۔ اس دور میں ایرانی ادبیات کا احیا ہوا اصناف سخن میں سے رباعی، مثنوی اور قصیدہ تو اپنے انتہائی عروج پر پہنچے۔ ابو سعید ابوالخیر، عبداللہ انصاری بابا طاہر عریاں اور حکیم فیلسوف عمر خیام نے رباعی میں شہرت حاصل کی۔ عطار اور سنائی اور کسی حد تک حکیم ناصر خسرو نے اخلاق اور تصوف کے مضامین مثنوی میں لکھے۔ نظامی گنجوی نے مثنوی لکھنے میں اتنا نام پایا کہ آج تک کوئی مثنوی نگار اُس پایہ کا پیدا نہیں ہوا امیر خسرو اور جامی نے نظامی کے "تتبع" میں خمسے لکھے ہیں۔ مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی [1]۔ ناصر خسرو نے اخلاقی قصائد بھی خوب لکھے ہیں۔ غزل اور قصیدہ میں امیر معزی، ابوالفرج رونی، ظہیر فاریابی، رشید الدین وطواط، انوری اور خاقانی جیسے بلند پایہ، قادر الکلام شاعر اسی دور میں ہوئے۔ علم بدیع و بیان پر فارسی زبان میں پہلی کتاب "حدائق السحر فی دقائق الشعر" اسی زمانے میں رشید الدین وطواط نے لکھی [2] حجۃ الاسلام امام غزالی اسی دور میں ہوئے ہیں۔ اس دور میں نظم، نثر، طب، نجوم، فلسفہ پر بہترین کتابیں لکھی گئیں۔

آیئے دیکھیں کہ اس علمی اور ادبی دور کے شعرا نے صنایع بدایع کے ساتھ کیا سلوک ملحوظ رکھا آیا قدما کی روایت پر عمل درآمد ہوا یا اُسے پس پُشت ڈال دیا گیا۔

رباعی صرف چار مصرعوں یا دو شعروں پر مشتمل ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے رباعی کا دامن اتنا تنگ ہوتا ہے کہ اُس میں صنایع بدایع کے تمام گلہائے رنگ رنگ سما ہی نہیں سکتے۔ تاہم ابو سعید ابوالخیر اور عمر خیام کی رباعیات صنایع بدایع سے خالی بھی نہیں۔

(۱) بہتر ازیں در جہاں ہمہ چہ بود کار
دوست بر دوست رفت یار بہ یار
آں ہمہ اندوہ بود وایں ہمہ شادی
آں ہمہ گفتار بود وایں ہمہ کردار (صنعت تضاد)

حاشیہ۔ [1] "مولوی مدن" کی تفصیل کے لئے دیکھو۔

[2] اس سے پہلے علم بیان و بدیع وغیرہ مضامین پر لکھی ہوئی کتابیں عربی زبان میں ہیں۔

(۲) دی آمدم و ہیچ نکردم کاری — امروز زمن گرم نشد بازاری
فردا بروم بے خبر از اسراری — ناآمدہ بہ بود ازیں بسیاری
(مراعات النظیر)

(۳) در عشق تو گہ پست وگہی مست شوم — دریاد تو گہ نیست گہی ہست شوم
در پستی ومستی ازنگیری دستم — یکبارگی ای نگار از دست شوم
(تضاد اور تجنیس)

(۴) دوری کہ درآں آمدن ورفتن ماست — اورانہ بدایت نہ نہایت پیداست
کس می نزندوم دریں معنی راست — کایں آمدن از کجا ورفتن بہ کجاست
(تضاد و طباق)

(۵) از روی حقیقتی نہ از روئے مجاز — مالعبتکانیم و فلک لعبت باز
بازیچہ ہمی کنیم بر نطع وجود — رفتیم بصندوق عدم یک یک بار
(تضاد ومراعات النظیر)

مثنوی میں نظامی گنجوی نے کمال دکھایا ہے۔ نظامی کی پانچوں مثنویوں میں بلاغت، فصاحت، زور کلام، معنی آفرینی، منظر کشی، جذبات نگاری غرض ہر وہ چیز ہے جس پر شاعر کو بجا طور پر ناز ہونا چاہیئے۔ لیکن نظامی کا کلام بھی صنایع بدایع سے خالی نہیں۔ بلکہ بعض حالات میں تو متواتر صنایع بدایع آتے ہیں۔ دیکھئے۔ مثنوی لیلیٰ مجنوں کا آغاز ہی اس شعر سے ہوتا ہے۔

ے
اے نام تو بہتریں سر آغاز
بے نام تو نامہ کی کنم باز

نام اور نامہ میں صنعت تجنیس زائد و ناقص ہے اور نامہ اور باز کردن میں بھی رعایت لفظی ہے۔ یہ مثنوی شروانشاہ، ابوالمظفر اخستان بن منوچہر کی فرمائش پر لکھی گئی تھی۔ اور اسی کے نام معنون ہے۔ فرماتے ہیں:۔

شروانشہ آفتاب سایہ
کیخسرو کیقباد پایہ

شاہ سخن انفساں کہ نامش
مہ بیست کہ مہر شد غلامش

کیخسرو اور کیقباد میں صنعت تلمیح ہے اور مہ اور مہر میں تجنیس حرف۔

مولانا شبلی لکھتے ہیں کہ "پنج گنج کے سوا نظامی کا اور بہت سا کلام تھا جو آج مفقود ہے دولت شاہ کا بیان ہے کہ اس میں غزلیں مرشات اور صنایع بدایع کے بیس ہزار شعر تھے۔" ؎۱

اس دور میں غزل اور قصیدہ کہنے والے بے شمار شاعر ہو گزرے ہیں۔ ہم ان میں سے صرف دو کے کلام پر ڈاکٹر رضا زادہ شفق مولف "تاریخ ادبیات ایران" کی رائے نقل کرتے ہیں اول انوری کہ جس کو قصیدہ گوئی میں پیغمبر مانا جاتا ہے۔

در شعر سہ تن پیمبرانند	ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را	فردوسی و انوری و سعدی

ڈاکٹر رضا زادہ شفق لکھتے ہیں۔ ؎۲

"انوری کی شاعری میں پچھلے استادوں کے قصیدوں کی تمام فنی خوبیاں کمال درجہ پر موجود ہیں الفاظ کی کثرت، تشبیہ کی لطافت، مضمون کی گہرائی، طرز ادا کی دلکشی، تجنیس، ایہام، استعارہ، تمثیل، صنایع اور خاص کر مبالغہ جو مدحیہ قصائد کی جان سمجھا جاتا ہے۔ غرض یہ سب چیزیں اس کے کلام میں ایک خاص بانکپن کے ساتھ موجود ہیں۔"

اب خاقانی کے متعلق بھی ڈاکٹر رضا زادہ شفق کی رائے دیکھیے۔ ؎۳

"خاقانی کی شاعری میں نہایت مشکل مضامین بھی ملتے ہیں۔ ہر قسم کے الفاظ اور ہر قسم کی ترکیبیں اس کے پاس پائی جاتی ہیں۔ اس کے کلام میں آیتیں، ضرب الامثال، اور اشارات و کنایات کی کمی نہیں۔ تجنیس تشبیہ، استعارہ وغیرہ شعری صنائع بھی اس کے پاس کافی پائے جاتے ہیں لیکن اس کا سب سے بڑا وصف یہ ہے کہ ان سب میں وہ ایک تازگی پیدا کر دیتا ہے۔"

حاشیہ:- ؎۱ شعر العجم حصہ اول (مطبوعہ لاہور ۱۹۴۹) صفحہ ۲۵۱

؎۲ تاریخ ادبیات ایران (مترجمہ سید مبارز الدین رفعت) صفحہ ۲۲۳

؎۳ تاریخ ادبیات ایران (مترجمہ سید مبارز الدین رفعت) صفحہ ۲۶۱، ۲۶۰

اور پھر آگے چل کر لکھتے ہیں :۔

"ان قصیدوں میں اس کا سبک ویسا ہی پرشکوہ، مرکب تشبیہوں، اغراق اور مبالغہ سے بھرا ہے۔ جیسا کہ خراسانیوں میں عام طور پر مروّج تھا لیکن جیسا کہ ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ اس قسم کی شاعری کو فنی نقطہ نظر سے دیکھنا چاہیئے اور کلام کی پختگی، فکر کی لطافت، تخیل کی بلندی، تشبیہہ، ایہام، تجنیس، اور نکتہ سنجی وغیرہ کو نظر انداز نہ کرنا چاہیئے۔"

ان اقتباسات کے بعد ہم انوری اور خاقانی کے کلام سے مثالیں دے کر اس مختصر سی تمہید کو طول نہیں دینا چاہیئے۔ ہمارا مقصد صرف یہ ظاہر کرنا تھا کہ سلجوقی دَور میں بھی صنایع بدایع کو شعراء کے کلام میں ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔

سلجوقی دَور کے بعد مغلوں اور تیموریوں کا زمانہ آیا۔ اس دَور میں بھی باوجود اتنی ویرانی اور پریشانی کے بڑے بڑے نامی گرامی علماء، فضلاء اور شعراء پیدا ہوئے۔ سعدی، جلال الدین رُومی، حافظ اور جامی اس دَور کے مشہور شاعر ہوئے ہیں۔ اسی زمانے میں شمالی ہندوستان میں بھی مسلمانوں کی سلطنت قائم ہو چکی تھی۔ سلطنت دہلی کی سرکاری اور درباری زبان فارسی تھی۔ چنانچہ اسی دَور میں ہندوستان میں فارسی کا ایک زبردست شاعر امیر خسرو پیدا ہوا جس کے کلام کا شہرہ آج تک ہندوستان، پاکستان، افغانستان اور ایران میں ہے۔ اور ایرانی باوجود نسلی تعصب کے امیر خسرو کے کلام کی تعریف کرتے آئے ہیں۔

اس دَور میں نظم کے علاوہ نثر میں بھی صنعت گری داخل ہو گئی۔ شیخ سعدی کی گلستاں میں مقفیٰ اور مسجع فقرے کثرت سے ملتے ہیں۔ لیکن تاریخ جہانگشائی مصنفہ عطا ملک جوینی تاریخ وصاف مصنفہ شہاب الدین عبداللہ شیرازی ملقب بہ وصاف اور تاریخ گزیدہ مصنفہ حمداللہ مستوفی اس قدر پر تکلف اور پر تصنع نثر میں لکھی گئیں۔ اور ان نثر نگاروں نے اپنے علم و فضل کا اس طرح سے اظہار کیا ہے کہ اس کی مثال کہیں نہیں ملتی۔ صنایع بدایع کی تمام مشہور اقسام نثر میں سمو دی گئی ہیں۔ انور سہیلی بھی اسی زمانے میں لکھی گئی اور اسی زمانے المعجم فی معاییر اشعار عجم لکھی گئی۔ جس میں عروض و قوافی و دیگر لوازمات شعر سے بحث کی گئی ہے۔ نقد شعر پر یہ فارسی کی اہم ترین کتاب ہے۔

اس دور کے شعراء میں سے ہم سعدی، حافظ اور جامی کے کلام کا جائزہ لیتے ہیں۔ سعدی کو

غزل کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے۔ اس کی غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

(۱) وقتی دل سودائی می رفت به بستانها
عیش و طرب آوردی برلاله و ریحانها (مراعات النظیر)

(۲) گه نعره زدی بلبل گه جامه دریدی گل
تا یاد تو افتادم از یاد برفت آنها (تکرار)

(۳) ای مهر تو در دلها وی مهر تو بر جانها
وی شور تو در سرها وی سر تو در جانها (تجنیس محرف)

(۴) تا عهد تو دربستم عهد همه بشکستم
بعد از تو روا باشد نقض همه پیمانها (تضاد یا طباق)

(۵) هر کو نظری دارد با یار کمان ابرو
باید که سپر باشد پیش همه پیکانها (مشاکلہ اور مراعات النظیر)

سعدی کے کلام کا عام انداز یہی ہے۔ اشعار میں صنایع بدایع ہیں۔ لیکن سعدی کا کمال یہ ہے کہ کلام کی روانی اور سلاست میں فرق آتا اور آورد کا رنگ کہیں پیدا نہیں ہوتا۔

خواجہ حافظ نے اپنے بعض ہم عصر شاعروں پر طعن کی ہے کہ وہ صنعت گر ہیں اور شعر رواں نہیں رکھتے۔ مگر خود حافظ کے کلام میں ایہام، مراعات النظیر، تجنیس اور صنعت طباق یا تضاد وغیرہ کی مثالیں کثرت سے موجود ہیں۔

(۱) شراب خورده و خوی کرده می روی بچمن
فروغ روی تو آتش در ارغوان انداخت (ایہام)

(۲) خرقه زہد مرا آب خرابات ببرد
خانهٔ عقل مرا آتش میخانه سوخت (مراعات النظیر)

(۳) دلم ز پرده برون شد کجائی ای مطرب
بنال هان که ازین پرده کار ما بوده است (تجنیس تام)

(۴) نا امیدم مکن از سابقۂ لطف ازل
تو پس پردہ چہ دانی کہ کہ خوب است و کہ زشت (تجنیس تام اور تضاد یا طباق)

(۵) نہ من از پردۂ تقویٰ بدر افتادم و بس،
پدرم نیز بہشت ابد از دست بہشت (تجنیس تام)

(۶) گفتم اے مسند جم جام جہاں بینت کو
گفت افسوس کہ آں دولت بیدار بخفت (تجنیس اور طباق یا تضاد)

(۷) مراد دل ز تماشائے باغ عالم چیست
بدست مردم چشم از رخ تو گل چیدن (مراعات النظیر)

(۸) نیست بر لوح دلم جز الف قامت یار
چکنم حرف دگر یاد نداد استادم (مراعات النظیر)

اب مولانا جامی کی ایک ہی غزل کے چند اشعار دیکھئے۔

(۱) ریزم ز مژہ کوکب بی ماہ رخت شبہا
تاریک شبی دارم با ایں ہمہ کوکب ہا (تعجب اور مراعات النظیر)

(۲) چوں از دل گرم من بگذشت خدنگ تو
از بوسۂ پیکانش شد آبلہ ام بلبہا (تجنیس قلب)

(۳) از بسکہ گرفتاراں مُردند بکوئ تو
بادش ہمہ جان باشد خاکش ہمہ قالبہا (تجنیس قلب اور مراعات النظیر)

(۴) از تاب و تب ہجراں گفتم سخن وصلت (تضاد، حسن التعلیل اور
برد ایں ہذیاں آری خاصیت آں تبہا، تجنیس زاہد و ناقص)

اسی زمانے میں ہندوستان میں امیر خسرو جیسا باکمال شاعر پیدا ہے۔ امیر خسرو نے اصناف سخن میں سے تقریباً ہر صنف میں شعر کہے ہیں۔ مثنوی میں نظامی گنجوی کے تتبع میں خمسہ لکھا۔ غزلیں اور قصیدے بے شمار ہیں۔ امیر خسرو کا کلام پانچ حصوں میں منقسم ہے۔

۱- تحفۃ الصغر۔ جوانی کا کلام ہے۔

(۲) وسط الحیوۃ۔ یہ بیس اور تیس سال کی عمر کے کلام کا مجموعہ ہے۔

(۳) غرۃ الکمال۔ تیس اور چالیس سال کی عمر کا کلام ہے۔

(۴) بقیہ نقیہ۔ یہ شاعر کے بڑھاپے کا کلام ہے۔

(۵) نہایۃ الکمال۔ یہ امیر خسرو کی زندگی کے آخری دنوں کا کلام ہے۔

امیر خسرو نے ہر صنف سخن میں طبع آزمائی کی ہے اور ان کے اشعار میں ہر قسم کی خوبیاں موجود ہیں امیر خسرو نے نثر نویسی کے اصول اور قواعد بھی منضبط کئے ہیں اور اعجاز خسروی کے نام سے ایک کتاب لکھی۔ اس کتاب میں امیر خسرو نے صنایع بدایع پر اس قدر محنت صرف کی کہ کسی اور شاعر یا ادیب کی نظم و نثر میں اس کی نظیر ملنا مشکل ہے۔ بھلا ایسا شاعر صنایع بدایع کے پیچ و خم میں خود کیوں نہ گرفتار ہوتا صنایع بدایع میں سے صنعت طباق یا تضاد تو امیر خسرو کے تقریباً ہر شعر میں ہے۔ چند اشعار دیکھئے

(۱) درد ہا دادی و درمانی ہنوز	جاں ز تن بردی تو در جانی ہنوز
(۲) ز بند دو جہاں آزاد گردم	اگر تو ہمنشیں بندہ باشی
(۳) من درویش را کشتی بغمزہ	کرم کردی الٰہی زندہ باشی
(۴) خرد سالی بمن کند بیداد	اے بزرگان شہر داد دہید
(۵) می روی و گریہ می آید مرا	ساعتی بنشیں کہ باراں بگذرد

امیر خسرو کے قصاید میں بھی صنایع بدایع کی کثرت ہے۔ موعظت و اخلاق میں ان کا ایک قصیدہ بحر الابرار بڑا مشہور قصیدہ ہے۔

اس طویل قصیدے کے تقریباً ہر شعر میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ پہلے مصرع میں کوئی دعویٰ ہے اور دوسرے مصرع میں اس کی دلیل دی گئی ہے۔ اس کے چند اشعار بطور مثال کے دیکھئے۔

(۱) کوس سر خالی و بانگ غلغلش در دسر است	ہر کہ قانع شد بخشک و ترشہ بحر و بر است
(۲) عاشقی زینت دہ مرداں را بینہ زحمت است	سلسلہ بند است و شیراں را بگردن زیور است
(۳) مرد پنہاں در گلیمی بادشاہ عالم است	تیغ خفتہ در نیامے پاسبان کشور است
(۴) مرد چوں در ریا کو شد مرید شہوت است	بیوہ زن چوں رخ بیاراید بہ بند شوہر است
(۵) کار این جا کن کہ تشویش است در محشر بسے	آب زیں جا بر کہ در دریا بسے شور و شر است

تیمور کی وفات کے بعد اُس کی اولاد نے کوئی سو سال تک حکومت کی۔ لیکن ان میں تیمور کی بات نہ تھی۔ اس وجہ سے تیموری سلطنت پر روز بروز زوال آتا گیا۔ اسی دوران میں اسماعیل نامی ایک دلیر اور فتح مند جوان نمودار ہوا۔ یہ شخص شیخ صفی الدین اردبیلی کی اولاد میں سے تھا۔ اور شیخ صفی الدین اردبیلی اپنی روحانی سیادت کے لیے مشہور تھے۔ اسماعیل نے روحانی سیادت کے ساتھ سیاسی سیادت کو بھی ملا لیا۔ اور چند دنوں میں اسے اتنی طاقت حاصل ہوگئی کہ اس نے شمالی ایران کا بہت سا علاقہ زیر نگیں کر لیا۔ اور ۹۰۵ھ میں تبریز کو دارالامن بنا کر صفوی سلطنت کی بنیاد رکھی۔ پھر کچھ مدت کے اندر پورے ایران پر قبضہ کر لیا۔

صفوی بادشاہوں نے شیعیت کو ایران کا سرکاری مذہب قرار دیا۔ اس لئے اس عہد میں مذہبی نظم و نثر کو فروغ حاصل ہوا۔ شعراء نے بادشاہوں کی مدح لکھنے کی بجائے نعت رسول، منقبت اولیاء آل رسول کی مدح اور ان کے مرثیہ کو اپنا موضوع سخن بنایا۔ علماء نے شیعوں کے اخبار و آثار اور شیعی فقہ و حدیث کی شرحیں لکھنا شروع کیا اور وہ شاعر جن کا شعار غزل اور قصیدہ لکھنا تھا۔ بددل ہو کر گوشہ نشین ہوگئے اور اکثر نے ہندوستان کا رُخ کیا جہاں اکبر اور اس کی اولاد شعر و سخن کے دلدادہ اور شعراء کے مربی تھے۔ ان شاعروں میں نظیری، عرفی، کلیم، صائب، طالب آملی، ظہوری ترشیزی اور بیدل اپنے اپنے عہد میں بہت مشہور ہوئے اور ان کا کلام سبک ہندی کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ غالب نے اپنے فارسی کلام میں اکثر انہی کا تتبع کیا ہے۔ اور انہی کے تتبع پر فخر کیا ہے مثلاً نظیری کا نام ادب سے یوں لیا ہے۔

۱۔ جواب خواجہ نظیری نوشتہ ام غالب
خطا نمودہ ام و چشم آفریں دارم

۲۔ زفیض نطق خویشم با نظیری ہمزباں غالب
چراغی را کہ دودی ہست در سر زود در گیرد

۳۔ اے ساختہ غالب از نظیری
با قطرہ ربائے گوہر آور

۴۔ بہ تازہ گشت غالب سخن نظیری از تو
سزد ایں چنیں غزل را بسفینہ ناز کردن

۵۔ غالب مذاق ما نتواں یافتن ز ما
رو شیوۂ نظیریؔ و طرز حزیں شناس

صائب کو ان الفاظ میں یاد کیا ہے :۔

۱۔ ذوق فکر غالب را بردہ ز انجمن بیروں
با ظہوری و صائب محو ہم زبانیہاست

۲۔ ایں جواب آں غزل غالب کہ صائب گفتہ است
در نورد نقشہا بے اختیار افتادہ ام

عرفی کو یوں یاد کیا ہے۔

۱۔ از جستہ جستہ غالب و من دستہ دستہ ام
عرفی کیست لیک نہ چوں من دریں چہ بحث

۲۔ کیفیت عرفیؔ طلب از طینت غالب
جام دگراں بادۂ شیراز ندارد

۳۔ گفتہ ام غالب طرف با مشرب عرفی کہ گفت
روئے دریا سلسبیل و قعر دریا آتش است

۴۔ چوں نتازد سخن از مرحمت خویش بدہر
کہ بُرد عرفی و غالب بعوض باز دہد

ظہوری کا نام اپنے اشعار میں سب سے زیادہ لائے ہیں اور اُسے ادب واحترام کے نام سے یاد کیا ہے۔

۱۔ ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب
میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

۲۔ غالب بشعر کم ز ظہوری نیم ولے
عادل شہ سخن رس دریا نوال کو

۳۔ دریں شتیزہ ظہوری گواہ غالب بس
من وز کوئے تو عزم سفر دروغ دروغ

۴۔ غالب از جوش دم ما ترتبش گلپوش باد
پردۂ ساز ظہوری را گل افشاں کردہ ام

۵۔ غالب از صہبائے اخلاق ظہوری سرخوشیم
پارۂ بیش است از گفتار ما کردار ما

۶۔ بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالب
رگ جاں کردہ ام شیرازہ اوراق کتابش را

اپنے اردو اشعار کے ضمن میں بیدل کا نام بھی بڑی عزت سے لیا ہے۔

۱۔ مجھے راہ سخن میں خوف گمراہی نہیں غالب
عصائے خضر صحرائے سخن خامہ ہے بیدل کا

۲۔ مطرب دل نے مرے تار نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پے نغمۂ بیدل باندھا

۳۔ اسد ہر جا سخن میں طرح باغ تازہ ڈالی ہے
مجھے رنگ بہار ایجادی بیدل پسند آیا

ان تمام شعراء میں سے جن کے تتبع پر غالب نے فخر کیا ہے یا اپنے کلام کو ان کے کلام کے مقابلہ میں پیش کیا ہے۔ ہم، اختصار کلام کے پیش نظر، صرف ظہوری اور بیدل کے کلام پر ایک نظر ڈالیں گے اور دیکھیں گے کہ اُن کے کلام میں صنایع بدایع کس حد تک جلوہ گر ہیں۔

نورالدین ظہوری ترشیز علاقہ سبزوار کا رہنے والا تھا۔ علوم و فنون کی تحصیل سے فارغ ہوا تو سیاحت کرتا ہوا دکن میں پہنچ گیا۔ بیجا پور (دکن) میں اُس وقت ابراہیم عادل شاہ حکمران تھا ظہوری نے اس کی مدح میں نظم و نثر میں اپنی صنعت گری کا کمال دکھایا۔ ابراہیم عادل شاہ سخن فہم، سخن سنج اور سخن پرور تھا۔ خود بھی ایک خوشگو شاعر تھا اور ایک کتاب "نورس" کا مصنف اُسے ظہوری کی نظم و نثر بہت پسند آئی اور اس نے ظہوری اپنے دربار میں ایسا بلند درجہ عطا کیا کہ ظہوری نے پھر کہیں اور

جانا پسند نہ کیا اور اپنی ساری زندگی وہیں گزار دی ۔ اسی قدر دانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے غالب نے کہا ہے :۔

غالب بشعر کم ز ظہوری نیم ولے
عادل شہِ سخن رس دریا نوال کو

ظہوری کے فارسی نثر میں لکھے ہوئے تین مضامین "سہ نثر ظہوری" کے نام سے زیورِ طباعت سے آراستہ ہوئے ۔ سہ نثر ظہوری ابراہیم عادل شاہ اور اس کی تصنیف "نورس" کی تعریف میں ہے اور اس کا اسلوب اتنا پُر تکلف اور پر تصنع ہے کہ مطلب الفاظ کے پیچ و خم میں الجھ کے رہ جاتا ہے نثر اول کے شروع کا ایک فقرہ دیکھیے ۔

"سرود سرایان عشرت کوہ قال کہ بنورس سرا بستان حال کارکام در زبان ساختہ بشہد ثنای صانعی عذب البیانند کہ چاشنی نغمہ ہای شکریں در رگ و پی نی دوانیدہ و خوش نفسان چمن نشاط کہ بہ بسط بساط انبساط پرداختہ بزلالِ حمد خالقی رطب اللسانند کہ ترانہ ہای ترا زنشاخسار صوت و صدا دمانیدہ"

ظہوری کے اشعار نسبتاً آسان زبان میں ہیں ۔ البتہ قصائد میں ہر قسم کا تکلیف اور تصنع روا رکھا گیا ہے ۔ ایک قصیدہ کے چند ابتدائی شعر یہاں نقل کیے جاتے ہیں ۔ یہ قصیدہ حکیم محمد یوسف بیجاپوری کی مدح میں ہے جس کی وساطت سے ظہوری کو سلطان ابراہیم عادل شاہ کے دربار میں رسائی حاصل ہوئی تھی ۔

۱۔ خموش چوں شوم از غیب می کنند صدا
کُرب مبند ز مدحِ اجلّۃ الحکماء

۲۔ مسیح عصر شفا ، خضر وادی الہام
سمیِّ خیر خلایق ، عزیز مصر لقا

۳۔ زہی کریم نہادی کہ درق کلکش ،
نیافریدہ خدا نون متصل با یا

۴۔ چراغ بزم ضمیر تو ثابت و سیّار
گیاہ گلشن جودِ تو سدرہ ، طوبیٰ

۵۔ ز رشحہ منبعِ علم تو پاک ذہن ورع

بقامت عملت راست خلعت تقوی

۶۔ زبسکہ دست سخای تو بر جہاں امروز

گہر فشاند گراں گشت دامنِ فردا

۷۔ مو شح ہست بنام تو نظم فضل و خرد

مزین است بوصف تو نثر فہم و ذکا

یہ قصیدہ تقریباً ساٹھ اشعار پر مشتمل ہے اور اس میں ہر قسم کے صنایع بدایع مذکور ہیں۔ ان چھ سات اشعار میں بھی صنعت طباق یا تضاد، صنعت ترصیع، صنعت مہا، صنعت، صنعت تنسیق الصفات اور صنعت مراعات النظیر صاف نظر آ رہی ہیں۔

دوسرے شعر کے دوسرے مصرع میں کنایہ کی جو صورت ہے۔ وہ کسی اور شاعر کے کلام میں کم ہی نظر آئیگی۔ سمی کے معنی نام والا ہے اور خیر خلائق یا خیر الوریٰ رسول اکرم کو کہتے ہیں۔ سمی خیر خلائق سے محمد مراد ہے۔ عزیز مصر یوسف تھے اور لقا صورت ہے۔ عزیز مصر لقا سے مراد یوسف ہے اور یہ سارا مصرع محمد یوسف (ممدوح) کے نام کا کنایہ ہے۔ تیسرا شعر بھی لطف سے خالی نہیں۔ ممدوح اتنا کریم ہے کہ کسی کو "نہ" نہیں کہتا۔ اس مفہوم کو یوں ادا کیا ہے کہ خدا نے اس کی قلم میں ن اور ی کو اکٹھا پیدا ہی نہیں کیا اور نی اور نی میں تجنیس کی صنعت بھی ہے۔

ظہوری کے دیوان غزلیات میں صرف ردیف ت پر ایک سرسری نظر ڈالنے سے صنایع بدایع کی مندرجہ ذیل مثالیں حاصل ہوئی ہیں۔ سارے دیوان کا اسی سے اندازہ لگالیں۔

۱۔ صنعت طباق یا تضاد

۱۔ زمین درد تو گشتم علم بآزادی	زقید نالہ نفس را دمی رہائی نیست
۲۔ گر ظہوری کرد در پیری جوانی عیب نیست	چشم مستش بادہ در جام جوان و پیر ریخت
۳۔ ہر جا خرابی ہست در آبادی من است	رشک اسیری ہم ز آزادی من است
۴۔ خورش غنی گشتہ ظہوری بہ نیاز	سود از ناز خریدن کردہ است،

۲۔ صنعت مراعات النظیر

۱۔ ہان ظہوری زگل مہر یاری نرسید — کمتر از خار وخسی کار گلستاں شدہ است

۲۔ خمخانہ ایست ہر بُن مو ستیم مپرس — ایں بادہ در پیالہ من از سبوی کیست

۳۔ قلم شکستم و اندوہ نامہ کردم مہر — چہ حرف در لب قاصد نہم خبر تنگست

۳۔ صنعت تجنیس

۱۔ از ظہوری است کحل خاکِ رہش — دیدۂ دیدہ را جلای ہست

۲۔ باکو ہکنم مسنج در عشق — گر پیشتر است بیشتر نیست

۳۔ جای خود را کرد آخر غیر در پہلوی اُو — گر نویسم حرف بیجای بجا خواہم نوشت

۴۔ صنعت اشتقاق

۱۔ دید مارا چشم بر دیدار تست — گفت مارا گوش بر گفتار تست

دید اور دیدار، گفت اور گفتار میں صنعت تجنیس مذیل بھی ہے۔

۲۔ عشق تقسیم ہست و بودم کرد — دل ز دلدار و جاں ز جاناں است

اس میں صنعت تقسیم بھی ہے۔

۵۔ صنعت مقابلہ

۱۔ بدہ می، بزہد و مارا چہ نسبت — سرودی باد را و مارا چہ نسبت

۲۔ کدا مند پیشت چہ شیریں چہ لیلی — بمجنوں و فرہاد مارا چہ نسبت

۳۔ ترا خورشید گفتن آنچناں است — کہ کس خورشید را گوید کہ ماہ است

۶۔ حسن التعلیل

۱۔ شدہ است سینۂ ظہوری پُر از محبت یار — برای کینۂ اغیار در دلم جا نیست

۲۔ پایۂ شمشاد از گل پست تر — بلبل از قمری بلند افغاں ترست

۳۔ دعوی دریا بچشم من غلط — دانہای اشک من غلطاں ترست

۷۔ صنعت تقسیم

۱۔ عشق آباد و عقل ویرانست — ایں بہ بستاں و آں بزندانست

۲- عقل تقسیم ہست و بودم کرد   دل ز دلدار جان ز جانانست

۸- صنعت تلمیح

۱- بہر خود دامن بکنج درد و غم   عذرہا از جانب عذرا گرفت

عذر اور عذرا میں صنعت تجنیس زاید و ناقص بھی ہے۔

۲- حیرت آرد داستان نامرادیہای عشق   لے عجب یعقوب محروم و زلیخا محرم است

محروم اور محرم میں صنعت تجنیس زاید و ناقص بھی ہے۔

ان چند مثالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ ظہوری کے کلام میں صنایع بدایع کو کافی دخل ہے اور غالب اس سے ضرور متاثر ہوا ہو گا۔

بیدل کے کلام میں صنایع بدائع نسبتاً کم ہیں اور جو صنایع بدایع اشعار میں ملتے ہیں۔ اُن کی ایسی صورت ہے کہ خود بخود کلام کی زینت بن گئے ہیں۔ شاعر نے اُن پر کلام کی بنیاد نہیں رکھی۔ غالب نے بیدل سے جو اثر قبول کیا وہ تشبیہ و استعارہ کی نُدرت ہے۔ مضمون آفرینی ہے۔ جدت ادا اور جدت بیان ہے۔ بیدل کے کلام میں استعارات ایسے پیچ در پیچ ہیں کہ جن کے سمجھنے کے لئے کافی غور کرنا پڑتا ہے۔ بیدل کا دیوان شعرا کے مروجہ دستور کے مطابق حمد سے شروع ہوتا ہے۔ حمد کے ان چند اشعار پر غور کیجئے۔ اور خوبی استعارہ اور جدت اظہار و ادا کی داد دیجئے۔

۱- باوج کبریا کز پہلوی عجز است راہ آنجا
سر موی گرینجا خم شوی بشکن کلاہ آنجا

۲- ادب گاہ محبت ناز شوخی برنمیدارد
چو شبنم سر بمہر اشک می بالد نگاہ آنجا

۳- بیاد محفل نازش سحر خیز است اجزا یم
تبسم تا کجا ہا چیدہ باشد دستگاہ آنجا

۴- ز طرز مشرب عشاق سیر بے نوائی کن
شکست رنگ کس آبی ندارد زیر کاہ آنجا

۵- خیال جلوہ زار نیستی ہم عالمے دارد
ز جیب ما سری باید کشیدن گاہ گاہ آنجا

۶۔ زمین گرم با افسون دل بے مدعا بیدل

دراں وادی کہ منزل نیزمی بافند راہ آنجا

غالب نے بیدل سے مشکل گوئی اور مشکل پسندی سیکھی ہوگی۔ غالب نے بیدل سے جدت ادا سیکھی ہوگی۔ غالب کو طرز بہار ایجادی بیدل پسند آیا ہوگا۔ ان امور پہ بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے مگر ہم وثوق سے کہہ سکتے ہیں کہ غالب بیدل کے صنایع بدایع سے بہت زیادہ متاثر نہیں ہوا ہوگا تاہم بیدل کے کلام کو صنایع بدایع سے خالی بھی خیال نہ کیجیے۔ تقریباً ہر قسم کی مثالیں اُس کے کلام میں بھی موجود ہیں۔ درج ذیل اشعار "مشتے نمونہ از خروارے" دیکھیے

۱۔ کدام موج دریں بحر بے تردد ہاست
کہ ہر چہ ہست نہاں غیر آشکار نزیست (تضاد یا طباق)

۲۔ نور جاں در ظلمت آباد بدن گم کردہ ایم
آہ ازاں یوسف کہ ما در پیرہن گم کردہ ایم (تضاد اور تلمیح)

۳۔ ہر قدر اُو چہرہ می افروخت ما می سوختیم
در خور عرض بہار او خزانی داشتیم (ایہام اور تضاد)

۴۔ حساب سایہ خورشید تا ابد باقی است
ادب پرستی دیدار مشکل افتادہ است (تجنیس قلب)

۵۔ بیند کہ در دل چشم یاس نمیرد
قربان تو قربان تو قربان تو باشد

۶۔ نظارۂ کونین بہ کرفین نہ پرداخت
پیداست کہ حیران تو حیران تو باشد (صنعت تکرار)

۷۔ آنجا کہ بہ تحریر رسد صفر شوقت
از نیزۂ خورشید تراشید قلم ما (مراعات النظیر)

۸۔ عاشقاں را صندل آسودگی دردِ سر است
تا بسر صدی نباشد دردِ سر داریم ما (عکس)

۹۔ چنیں کشتۂ حیرت کیستم من
کہ چوں آتش از سوختن زیستم من (تعجب اور حسن تعلیل)

۱۰۔ بجز کشتی شکستن ساحل امنی نمی باشد
کہ از وسعت فرو بر دست ایں دریا کرانہا را (مراعات النظیر اور مذہب کلامی)

۱۱۔ وحشت متاع قافلہ سوشت فرصتم
محمل بدوش عمر شرر می کشیم ما (مراعات النظیر اور مشاکلہ)

۱۲۔ بیدل از فطرت ما قصر معانی است بلند
پایہ دارد سخن از کرسی اندیشۂ ما (تصلیف)

فارسی شعرا کے کلام پر نظر ڈالنے سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ صنایع بدایع ہر ایک شاعر کے کلام میں موجود ہیں۔ کسی کے ہاں کم اور کسی کے ہاں زیادہ۔ اکثر اساتذہ نے صنایع بدایع کا استعمال ایسی عمدگی سے کیا ہے کہ کلام کی سلاست اور روانی میں فرق نہیں آتا۔

مولانا شبلی فارسی شاعری کا عام جائزہ لیتے ہوئے شعر العجم حصہ چہارم میں فرماتے ہیں۔ "صنایع بدایع جس قدر ہیں تقریباً سب عرب سے لئے ہیں۔ فرخی نے صنایع بدایع پر سب سے پہلی کتاب لکھی۔ اس کا نام ترجمان البلاغت ہے اس طرف زیادہ توجہ کی وجہ یہ ہوئی کہ اسی زمانہ کے قریب عبداللہ بن المعتز نے صنایع بدایع پر ایک کتاب لکھی اور یہ اس فن کی سب سے پہلی تصنیف تھی۔ اس کے بعد قدامہ نے اس پر اضافہ کیا یہ کتابیں تمام ملک میں پھیل گئیں اور نہایت مقبول ہوئیں۔ فرخی نے فارسی زبان میں اس کو نقل کیا تو یہ صنایع اور بھی عام ہوئے اسی کا یہ اثر ہے کہ قدیم شعرا کی بساط میں لفظی صنایع کے سوا کچھ نہیں۔ غور کرو عبدالواسع جبلی، ادیب صابر، عمعق، امیر معزی، رشید الدین وطواط، ازرقی ہروی کے کلام سے یہ تکلفات نکال دیئے جائیں۔ تو ان کے پاس کیا رہ جاتا ہے۔

صنایع بدایع کی روایت فارسی سے اردو شاعری میں آئی اور بعض اردو شاعروں نے فارسی شعرا کی تقلید میں اتنا جوش دکھایا کہ کلام کو ارادۃً صنایع بدایع سے سجایا۔

اردو شاعری میں صنایع بدایع کے استعمال پر مفصل بحث اگلے باب میں ہوگی۔

باب سوم

اُردو شاعری میں صنایع بدایع

اُردو شاعری پر فارسی شاعری کا اس قدر زیادہ اور گہرا اثر پڑا کہ دونوں میں سوائے تفاوت الفاظ کے اور کوئی فرق نہ رہا۔ اردو شاعری نے بحریں اور قوافی فارسی سے لیے۔ اصناف سخن یعنی غزل قصیدہ، مثنوی، رباعی، ترکیب بند، ترجیع بند، وغیرہ میں فارسی شاعری کی نقل کی۔ تشبیہات، استعارات تلمیحات، صنایع بدایع حتیٰ کہ ایک حد تک خیالات بھی فارسی سے مستعار لیے۔ لیلیٰ و مجنوں، شیریں فرہاد وغیرہ تلمیحات فارسی سے اردو میں آئیں۔ گل و بلبل، سرو و قمری، شمع و پروانہ وغیرہ تشبیہات کا ماخذ فارسی ہی ہے۔ زبان اُردو کے ابتدائی دَور میں ہمارے شاعروں نے فارسی شاعروں کی پوری پوری نقل کی۔ اس زمانے کے باکمال بزرگوں کے چند ایک شعر دیکھیے۔ اور مقابل میں فارسی کے اشعار دیکھ کر اندازہ لگائیے کہ اردو نے فارسی کی کس حد تک نقل کی ہے۔

فارسی	اُردو
۱۔ شب مرا تا بروز خواب نبود	۱۔ آج کی رین مجھ کو خواب نہ تھا
در دو چشمم بغیر آب نبود	دو نو آنکھوں میں غیر آب نہ تھا
(حسن)	(ولی)

۲۔ ای حسن یار گر خطای گزید
ہم شکایت از و صواب نبود

۲۔ گلہ شوخ اسے ولی کرنا
ہر کسی کن مجھے صواب نہ تھا

۳۔ دگر نہ رتبہ نظم است ازچہ روصائب
مقام بر سر چشم است بیت ابرو را

(صائب)

۳۔ مت شعر پر تو چشم حقارت سے کر نظر
مانند ابرو کے انکھاں ہے جائے بیت

(ولی)

۴۔ حسن سبزہ بخط سبز مرا کرد اسیر
دام ہمرنگ زمین بود گرفتار شدم

(غنی)

۴۔ خط سبز آفت جان تھا مجھے معلوم نہ تھا
دام سبزے میں نہاں تھا مجھے معلوم نہ تھا

(فدوی)

۵۔ عام حکم شراب می خواہم
محتسب را کباب می خواہم

(خسرو)

۵۔ عام حکم شراب کرتا ہوں
محتسب کو کباب کرتا ہوں

(میر)

ہم اختصار کے لیے انھی مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں[1]۔ ان مثالوں سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ فارسی شاعری کا اردو شاعری پر بہت زیادہ اثر ہو۔ صنایع بدایع جیسا کہ ہم نے گزشتہ باب میں ذکر کیا ہے۔ فارسی شاعری میں عام تھے۔ اردو زبان کے شاعروں نے فارسی سے مستعار لے کر ان سے اپنے کلام کو سجایا۔ اور خصوصاً صنعت ایہام کو ایسا اپنایا۔ کہ وہ اس ابتدائی دور کا مخصوص رنگ قرار پایا۔

ایہام، ہندوستان کی قدیم زبان سنسکرت میں بھی تھا سنسکرت سے ہندی یا برج بھاشا میں آیا۔ اور برج بھاشا یا ہندی سے اردو میں داخل ہوا۔ اور اس طرح ایہام کا اثر اردو شاعری پر دونوں طرف سے ہوا۔ اور بڑی طاقت سے اردو شاعری میں نمودار ہوا۔

آزاد لکھتے ہیں[2]

"نظم اردو کے آغاز میں یہ امر قابل اظہار ہے کہ سنسکرت میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی

حاشیہ[1] اس قسم کی اور بے شمار مثالیں دیکھنے کے لیے ملاحظہ ہو چمنستان شعرا مصنفہ شفیق اورنگ آبادی۔
[2] آب حیات (مطبوعہ شیخ مبارک علی) پندرھواں ایڈیشن صفحہ ۸۰

معنی ہیں۔ اسی واسطے اس میں اور برج بھاشا اس کی شاخ ہیں ذو معنین الفاظ اور ایہام پر دوہروں کی بنیاد ہوتی تھی۔ فارسی میں یہ صنعت ہے مگر کم۔ اُردو میں پہلے پہلے شعر کی بنا اسی پر رکھی گئی۔ اور دَور اوّل کے شعرا میں برابر وہی قانون جاری رہا۔ اس عہد کے چند اشعار نمونہ کے طور پر لکھتا ہوں۔

۱۔ کیوں نہ ہم سے ہو وہ سمن باغی	قد ہو جس کا نہال کی مانند
۲۔ لام نستعلیق کا ہے اس بت خوشخط کی زلف	ہم تو کافر ہوں اگر بندے نہیں اسلام کے
۳۔ تو جو دریا کے پار جاتا ہے	دل مرا وار وار جاتا ہے
۴۔ تم دیکھو یا نہ دیکھو ہم کو سلام کرنا	یہ تو قدیم ہی سے سر پہ ہمارے کر ہے
۵۔ نہ ملو ہم سے کے دل وہ جعد شکیں	اگر باور نہیں تو مانگ دیکھو"

ایہام گوئی کے متعلق ڈاکٹر محمد حسن لکھتے ہیں ؎۱

" ایہام گوئی کے رواج کی دو وجوہ اور بھی قابلِ غور ہیں۔ ایک یہ کہ ہر ایسے دور میں جب محفلِ نشاط گرم ہو اور عیش و مستی کی طرف لوگوں کی توجہ مبذول ہو۔ الفاظ کے پہلودار استعمال کی طرف ذہن منتقل ہونے لگتا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہوتی ہیں۔ ایک اس وجہ سے کہ عشق و عاشقی داخلی جذبہ کے ساتھ ساتھ ایک اجتماعی عیش و نشاط کا موضوع بن جاتی ہے۔ اور عشق کا بیان رمز و کنایے میں مزا دیتا ہے۔ اسی وجہ سے پہلودار الفاظ کا استعمال لامحالہ زیادہ ہونے لگتا ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ ایسے دور میں جب محفلیں آباد ہوں اور اجتماعی زندگی کا راگ رنگ ہر طرف بکھرا ہوا ہو۔ ضلع جگت اور ذو معنی الفاظ سے پھبتی، کنایہ اور بدیہہ گوئی میں لطف پیدا ہو جاتا ہے۔ دوسری اہم وجہ یہ ہے کہ ریختہ گو شعرا کو اس ابتدائی دور میں خصوصیت کے ساتھ اپنی وسعتِ زبان کا احساس ہوا ہوگا۔ ایک طرف تو وہ عربی اور فارسی کے الفاظ اور تراکیب مضامین اور تلمیحات کو بے محابا استعمال کر سکتے تھے۔ دوسری طرف کھڑی بولی اور عام بول چال کے الفاظ اور ہندی افعال و اسما اُن کے اپنے تھے۔ بول چال کے محاورے اور بات چیت کے موڑ پھیر اور نئے نئے پہلو بھی پیدا ہو رہے تھے۔ اس لیے لفظ اور محاورے کی حیثیت ہشت پہلو نگینہ کی سی ہو رہی تھی۔ جس سے مختلف کام لیے جا سکتے تھے۔ ان الفاظ و تراکیب کی نوعیت کو متعین کرنے

؎۱۔ اردو شاعری کا فکری اور تہذیبی پس منظر (پہلا ایڈیشن) صفحہ ۲۸۲

اور ان کو واضح شکل میں ڈھالنے کا کام ایہام گو شاعروں کے ہاتھوں شروع ہوا۔"

"ایہام اور صنعت گری زبان کے فن کے بلوغ تک پہنچنے سے پہلے کی منزل ہے۔ جہاں الفاظ کی اہمیت اور معنوی قدر و قیمت کا احساس نمایاں ہونے لگتا ہے۔ اور مناسبت الفاظ کی طرف توجہ مبذول ہوتی ہے۔ دنیا کی دوسری زبانیں بھی اس سے خالی نہیں خصوصیت سے وہ زبانیں جہاں الفاظ کے متنوع اور مختلف معانی اور مرادفات کی تعداد زیادہ ہے۔ جیسے عربی اور سنسکرت۔ اور اردو کی نشو و نما میں ایک ایسی منزل آتی ہے۔ جہاں اسے لسانی طور پر چھان پھٹک کی ضرورت محسوس ہو۔ اور الفاظ کے مناسبات اور ان کے روابط اور متعلقات کا احساس ہو۔ اردو میں یہ ضرورت ایہام گوئی کے دور میں کسی حد تک پوری ہوئی۔ اور اس کی تکمیل لکھنؤ کے دبستان شاعری نے کر دی۔"

ولی دکنی کا زمانہ

اردو شاعری میں ولی دکنی پہلا صاحب دیوان شاعر ہے۔ جب تک ولی دکن میں رہے ان کا کلام مضمون اور زبان دونوں لحاظ سے بہت کچھ قابل اصلاح تھا۔ ولی دکن سے دہلی آیا۔ اور شاہ سعد اللہ گلشن سے ملاقات ہوئی۔ ولی نے ان کو اپنے اشعار سنائے تو شاہ صاحب نے ولی سے فرمایا۔

"این ہمہ مضامین فارسی کہ بیکار افتادہ اند در ریختہ خود بکار
برازتو کہ محاسبہ خواہد گرفت"

اور پھر ارشاد فرمایا:۔

"شما زبان دکنی راگذاشتہ ریختہ را موافق اُردوئے معلیٰ شاہجہان
آباد موزوں بکنید۔ تا موجب شہرت و رواج قبول خاطر صاحب
طبعان عالی مزاج گردد"

اگرچہ یہ پتہ چلانا مشکل ہے۔ کہ ولی نے حسب ہدایت شاہ سعد اللہ گلشن فارسی زبان سے کیا کیا مضامین اخذ کئے۔ لیکن اتنا وثوق سے کہا جا سکتا ہے۔ کہ اس کے بعد ولی نے فارسی کے مشہور شعراء کے تتبع میں غزلیں لکھی ہیں: مثلاً امیر خسرو کی ایک مشہور غزل کا مطلع ہے۔

جان ز تن بُردی و در جانی ہنوز　　　دردہا دادی و در مانی ہنوز

ولی نے اسی زمین میں ایک غزل لکھی ہے۔ مطلع ہے

تو ہے رشکِ ماہِ کنعانی ہنوز
تجھ کو ہے خوباں میں سلطانی ہنوز

نظیری نیشاپوری کی ایک غزل ہے۔

چہ خوش است باد و یکدل سر حرف باز کردن
سخن نہفتہ گفتن گلہ را دراز کردن ؎۱

ولی نے اس زمین میں بھی غزل کہی ہے:-

ہے نازنیں صنم کا زلفاں دراز کرنا
فتنہ کا عاشقاں پر دروازہ باز کرنا

ولی نے کئی اور غزلیں فارسی شعراء کے تتبع میں لکھی ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ولی نے فارسی شاعری کی تمام روایات کو اردو میں منتقل کیا۔ صنایع بدایع جو فارسی شاعری کا ایک جزولاینفک بن چکے تھے ولی ان سے کس طرح بچ سکتا تھا۔ چنانچہ ولی کے کلام میں انتہائی سادگی اور سلاست کے باوجود صنایع بدایع بھی نظر آتے ہیں۔ مثلاً:

۱۔ دشمنِ دین کا دین دشمن ہے
راہزن کا چراغ رہزن ہے (عکس اور تکرار)

۲۔ عجب کچھ لطف رکھتا ہے شب خلوت میں دلبر سے
سوال آہستہ آہستہ جواب آہستہ آہستہ (تعجب طباق یا تضاد و تکرار)

۳۔ گناہوں کی سیہ نامی سے کیا غم اس پریشاں کو
جسے وہ زلف دستاویز ہو روز قیامت میں (ایہام)

۴۔ شعر فہموں کی دیکھ کر گرمی
دل ہوا ہے مرا کباب سخن (مشاکلہ)

؎۱ میں نے یہ مصرعہ یوں بھی پڑھا ہے ع سخن نگفتہ گفتن گلہ با دراز کردن

۵. مان سے تجھ لباں کے سرخ ہوا
جگر لالہ داغ داغ ہوا (حسن التعلیل)

۶. دل عشاق کیوں نہ ہو روشن
جب خیال صنم چراغ ہو (ایہام)

۷. اے ولی گلبدن کو باغ میں دیکھ
دل صد برگ باغ باغ ہو

(مراعات النظیر اور ایہام اور تکرار)

ولی کے کلام میں صنایع بدایع کثرت سے ہیں۔ اور اس دور کے دوسرے تمام شاعر بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے ہیں۔ آبرو، مضمون، یکرنگ اور شاکر ناجی سب کے سب صنایع بدایع کو کلام کی زینت سمجھتے تھے اور ایہام کے بالخصوص دلدادہ تھے۔ حسرت نامی ایک شاعر نے ایک پُر تصنع غزل لکھی۔ جس میں ناجی کے ایہام کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس غزل کے چند اشعار یہ ہیں۔

۱. گرچہ اس دل سے گیا ہے کر کے اب آرام رم
دور کرتا ہے ولیکن کچھ ترا پیغام غم

۲. شوق غنچے کو ہوا ہے بولنے کا باغ میں
بول منہ سے ہے کہاں تیرا بت گلفام کم

۳. شعر کی صنعتوں میں ہم سے ہو حسرت غزل
اور ناجی کی طرح لکھتے ہیں کب ایہام ہم

اب شاکر ناجی کے کلام سے صرف ایہام کے دو چار شعر دیکھئے۔ باقی صنایع بدایع سے ہم فی الحال قطع نظر کرتے ہیں۔

۱. اس کے رخسار دیکھ جیتا ہوں
عارضی میری زندگانی ہے

۲. رنگ تیرا گندمی دیکھا اور بدن مخمل سا صاف
ہوش کھو کر آدمی بھولے اپنی خور و خواب

۳. کنویں میں جا پڑا یعقوب کا دل
چلا سب نالہ و افغاں تے یوسف

۴. اگر ہو دولت ہند کبھی اشنان کو ننگا
جنیو میں دیکھ کر برہمن نے غوطہ میں جا گنگا

۵۔ محبت سے علیؓ کی دیکھ ناجیؔ ہوا ہے دل مرا اب حیدر آباد صلہ

۶۔ بہا مہنگا ہو یا سستا نہیں موقوف نرخے پہ یہ سب خرمن اُسی کے ہیں خدا ہو جس کے پلّے پر

۷۔ روئے روشن کی جو کوئی یاد میں مشغول ہے مہر اُس کے سامنے سورج مکھی کا پھول ہے

۸۔ ان بتوں کا ہم فقیروں سے کہو کیا کام ہے یہ تو طالب زر کے ہیں اور یاں خدا کا نام ہے

اب شاہ مبارک آبرو کے چند شعر دیکھئے۔ سب میں صنعت ایہام ہے۔

۱۔ یہ رسم ظالمی کی دستور ہے کہاں کا
دل چھین کر ہمارا دشمن ہوا ہے جاں کا

۲۔ رستم اُس مرد کی کھاتے ہیں قسم زوروں کی
تاب لا دے جو کوئی عشق کے جھک جھوروں کی

۳۔ یوں آبرو بنا دے دل میں ہزار باتاں
جب تیرے آگے آوے گفتار بھول جاوے

۴۔ اب دین ہوا زمانہ سازی
آفاق تمام دھر یا ہے

۵۔ جہاں اس خو کی گرمی تھی نہ تھی واں آگ کی جوت
مقابل اُس کے ہو جاتی تو آتش لکڑیاں کھاتی

۶۔ کیوں بلایا بھیڑ میں یہ ہم سے نادانی ہوئی
دخترِ رز بزم میں آ شرم سے پانی ہوئی

مضمونؔ بھی اس دور کے شاعر ہیں۔ اُن کی ایہام گوئی کا نمونہ دیکھئے۔

۱۔ کرے ہے دار بھی کامل کو سرتاج
ہوا منصور سے نکتہ یہ حل آج

صلہ غالب نے شاید ناجیؔ کے اسی شعر سے متاثر ہو کر فارسی میں کہا،

ے عالم توفیق لاغالب سواد اعظم مہر حیدر پیشہ دارم حیدر آباد خودم

۲۔ چلا کشتی میں آگے سے مرا محبوب جاتا ہے
کبھی آنکھیں بھر آتی ہیں کبھی دل ڈوب جاتا ہے

۳۔ میکدہ میں گر سراپا فعل نامعقول ہے
مدرسہ دیکھا تو واں بھی فاعل و مفعول ہے

اب مصطفیٰ خاں یکرنگ کے ایہام کے چند شعر سنیے:

۱۔ اگر آدے مرے گھر وہ پیارا	کروں اس ماہ کو پتلی کا تارا
۲۔ تجھ زلف کا یہ دل ہے گرفتار بال بال	یکرنگ کے سخن میں خوف ایک مو نہیں
۳۔ گر خبر لینی ہو تو لے صیاد	ہاتھ سے یہ شکار جاتا ہے
۴۔ جدائی سے تری اے صندلی رنگ	مجھے یہ زندگانی درد سر ہے
۵۔ لگے ہیں خوب کانوں میں بتوں کے	سخن یکرنگ کے گویا گہر ہیں

اس دور کے تمام شاعر صنایع بدایع اور ایہام کو کلام کا لازمی جزو سمجھتے تھے۔ اسی دور کا ایک شاعر فائز ہے۔ جو صنایع بدایع کو کلام کے بنیادی اجزا میں شمار کرتا ہے۔ چنانچہ اپنے خطبے میں لکھتا ہے ص۱

"کمال شاعر موقوف بر صنایع شعریہ است"

ہم نے اس دور کے چار مشہور شاعروں کے کلام سے ایہام کی مثالیں پیش کی ہیں۔ اس دور کی شاعری پر مولانا عبدالسلام ندوی شعرالہند میں تذکرہ قدرت کے حوالے سے یہ تنقید نقل فرماتے ہیں۔

"بعد از طبقہ شاعران دکن کہ معاصر ولی بودند رواج ایہام بسیار شد۔
سردفتر دسرآمد ایہام گو نجم الدین عرف شاہ مبارک متخلص بہ آبرو۔"

ان شعرا کے بعد شاہ حاتم کا ذکر آتا ہے۔ اس نے بھی زیادہ تر آبرو اور ناجی کے رنگ میں لکھا ہے دیکھیے تذکرہ قدرت ذکر شاہ حاتم

"نا تا زعم شاعری بسیار دارد۔ دیوان قدیم او از نظر ایں مؤلف گزشتہ، بطرز آبرو ناجی حرف می زند۔ اکثر اشعارش از لطف خالی یافتم۔"

ص۱ : فائز دہلوی کا دیوان۔ مرتبہ سید مسعود حسن رضوی صفحہ ۱۵۹

قایم نے "مخزن نکات" میں دکنی شعرا کی طبقہ بندی کرکے ان کو تین طبقوں میں تقسیم کیا ہے دوسرے طبقے کے ذکر میں لکھتے ہیں:۔

"شاعران ابتدائی زمانہ محمد شاہ باعتقاد خود تلاش
الفاظ تازہ وایہام نمودہ شعر را از مرتبہ بلاغت انداختند"

اور پھر تیسرے طبقے کے متعلق لکھتے ہیں۔

"طرز کلام اینہا مانا بہ ردیہ فارسی است چنانچہ جمیع
صنایع شعری کہ قرارداد اساتذہ سلف است بکار می برند"

مذکورہ بالا اقتباسات اور امثلہ کے مطالعہ سے ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں۔ کہ اردو شاعری میں قدما کا دور اوّل صنایع بدایع کا اس قدر دل دادہ تھا کہ اکثر شاعروں نے شعر کی بنیاد ہی صنایع بدایع اور ایہام پر رکھی ہے۔

میر و سودا کا زمانہ

اب ہم قدما کے دوسرے دور کی شاعری پر ایک نظر ڈالتے ہیں۔ اس دور میں میر و سودا دو مشہور بزرگ ہو گزرے ہیں۔ جو اردو شاعری کے مستند اور مسلم الثبوت استاد مانے جاتے ہیں۔ ان دونو شاعروں کا کلام اتنا مشہور ہوا۔ کہ بعد میں آنے والے تذکرہ نویسوں نے ان کے زمانے کو "میر و سودا کا زمانہ" کا نام دیا ہے۔ اور ان شاعروں کا ہمیشہ ادب و احترام سے نام لیا ہے

یاد رکھئے کہ ان دونو واجب الاحترام بزرگوں نے صنایع بدایع سے بالعموم اور ایہام سے بالخصوص اظہار تبری کیا ہے۔ سودا کا شعر ہے:

؎ یکرنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا میں ہوں

اور میر تقی میر فرماتے ہیں۔

؎ کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

ہم پہلے "سخن و شعر میں ایہام کے منکر" سودا کے کلام سے ایہام کی مثالیں پیش کرتے ہیں: جیسے،

۱۔ اس گلشن ہستی میں عجیب دید ہے لیکن
جب آنکھ کھلی گل کی تو موسم تھا خزاں کا

۲۔ کس قدر بنت العنب سے دل ہے سودا کا بُرا
زخم نے دل کے نہ دیکھا منہ کبھی انگور کا

۳۔ روشن ہے وہ ہر ایک ستارے میں زلیخا
جس نور کو تو نے مہ کنعاں میں دیکھا

۴۔ اس کے قامت کو صحن گلشن میں
ہو گئے دیکھتے ہی سرو نہال

۵۔ میوہ نخل امید سے سودا
جتنا چاہے تو کھا پہ توڑ نہ ڈال

۶۔ کیا جانیے کہ کس کے دل کا لہو پیا ہے
کنگھی نے آڑے ہاتھوں کیا زلف کو لیا ہے

۷۔ کمیت خامہ تازی ہے ترا پر کیا کہوں سودا
چلا دے ہے تمام اس کی عراقی ہو گئی ترکی

۸۔ لب و لہجہ ترا سا ہیگا کب خوبان عالم میں
غلط الزام ہے جگ میں کہ سب مصری کی ڈلیاں ہیں

۹۔ ساق سیمیں کو تری دیکھ کے گوری گوری
شمع مجلس میں ہوئی جاتی ہے تھوڑی تھوڑی

۱۰۔ اے لالچی تو کیونہ غیروں کا مت ہوئے
جو کچھ تو چاہے یک شب مجھ پاس آ کے سو لے

خود سخن میں ایہام کا منکر ہونے کے باوجود سودا کے کلام میں ایہام کی متعدد مثالیں موجود ہیں جن میں سے دس مثالیں ہم نے "مشتے نمونہ از خروارے" پیش کی ہیں۔ اب دیگر صنایع بدایع کی

بعض صورتیں سودا کے کلام میں دیکھیے :

۱۔ حُسن کے بازار میں کیا ہے جز اشیائے فراق
دے کے نقد دل نہ کر زنہار سودائے فراق (مراعات النظیر)

۲۔ خاموش اپنے کلبۂ احزاں میں روز و شب
تنہا پڑے پڑے در و دیوار دیکھنا

روز شب میں صنعت طباق یا تضاد ہے پڑے پڑے میں صنعت تکرار ہے اور در و دیوار میں مراعات النظیر ہے۔

۳۔ نے حرف نے حکایت و نے شعر و نے سخن (مراعات النظیر)
نے سیر باغ و نے گل و گلزار دیکھنا (مراعات النظیر)

۴۔ سودا پھر آج تیری آنکھیں بھر آئیاں ہیں
عالم کے ڈوبنے میں کل کچھ بھی رہ گیا تھا (مبالغہ)

۵۔ دوزخ مجھے قبول ہے اے منکر و نکیر
لیکن نہیں دماغ سوال و جواب کا (تلمیح اور صنعت طباق یا تضاد)

۶۔ جب بادہ خون دل ہو تو سیر چمن کجا
ساقی وہ نو بہار و شراب کہن کجا (ایہام تضاد)

۷۔ کاٹتے ہیں دل کو ابرو یار کے تلوار وار
یہ جگر کس کا ہے ان کا جن کو ہو ہموار وار (صنعت تجنیس تام)

۸۔ آج بیمار ترے کا ہے ترقی پر ضعف
صبح تھا زرد منہ اس کا سو ہوا شام سفید (تضاد اور ترصیع)

۹۔ فائدہ اب کیا کرے تریاق وصل
زہر غم ہجر اثر کر گیا (طباق یا تضاد)

۱۰۔ چمن دہر میں توام ہیں سدا شادی و غم
خندہ گل نہ رہے گریہ شبنم سے دور (ایہام تضاد)

اب سودا کی تین غزلیں صنعت لزوم مالایلزم میں لکھی ہوئی بھی دیکھئے۔ فی الحقیقت سودا نے ان غزلوں میں اپنی قادر الکلامی اور صناعی کا زور دکھایا ہے۔ مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان غزلوں میں شاعری کی بنیاد صنعت گری پر ہے۔ اور شاعر نے الفاظ کی شعبدہ بازی کو ہی شاعری کا کمال خیال کیا ہے۔

اس غزل میں صنعت تجنیس مزدوج ہے۔

۱۔ کاٹتے ہیں دل کو ابروئے یار کے تلوار دار
یہ جگر کس کا ہے ان کا جن کو ہو ہموار دار

۲۔ خون کی مجھ بیگنہ کے بس نہیں تیغ نگاہ
باندھ آیا ہے یہ کس کے قتل کو ہتھیار یار

۳۔ باغ تو جاتے ہو تم لیکن خدا کے واسطے
گل کو مت اپنے گلے کا کیجیو زنہار ہار

۴۔ ایک میں ہی کچھ تری خاطر نہیں پھرتا خراب
اے طبیب اپنی دوا سے تو یہ بیمار مار

۵۔ بات سنتا ہے بہ یک دشمنوں کی تو دل دے کے حیف
ہے سخن میرا تری خاطر پہ ہر یکبار بار

۶۔ آپ کو مت دیکھ جوں منصور واحد یار سے
چشم وحدت بیں کو ہے یاں جلوۂ دیدار دار

۷۔ آج کون آیا تھا گلشن میں خدا جانے کہ ہے
باغباں کا دل نزار و بلبل گلزار زار

۸۔ دیکھ سودا کو مغاں آپس میں کہہ اٹھتے ہیں لوگ
دختر رز کے لیے پھرتا ہے یہ میخوار خوار

ایک غزل میں یہ صنعت گری دکھائی ہے۔ کہ ہر شعر میں ایک حکم کے تحت چار چار چیزیں جمع کی ہیں یعنی چار چار چیزوں کا ذکر کیا ہے۔

۱. سنبل و زلف سیہ، کاکل و شب چاروں ایک
غمزہ و ناز و ادا، جنبش لب چاروں ایک

۲. دیکھئے کیونکہ بچے جی کہ ہوئے ہیں تیرے
تجھ بن اب درد و غم و رنج و تعب چاروں ایک

۳. گل و خورشید و مہ و شمع ترے چہرے سے
ہیں کسب کرنے میں یہ نور کا اب چاروں ایک

۴. شعلہ و برق و تجلی و شرر ای سودا
رکھتے ہیں زیر فلک حسب و نسب چاروں ایک

اب اس غزل کو دیکھئے۔ جو شاعر کے زور طبع کی سب سے زیادہ واضح دلیل ہے۔ اور اس کی صنعت گری پہ دال اس میں شاعر نے یہ التزام کیا ہے کہ پہلے تو صنعت ذوقافیتین ہے۔ یعنی قافیے دو ہیں۔ اور دوسرا التزام یا تقید یہ ہے کہ ہر مصرعے کے آخر میں صنعت تجنیس محرف ہے۔ اور حق یہ ہے کہ سودا نے اپنی صناعی کا اس میں کمال دکھایا ہے۔

۱. اس چمن کی سیر میں آیا رہوں مل کے ملّ
کیا بنائے صانع قدرت نے نرگس گل کے گُل

۲. یہ نہ ہو دریا کہ جس سے گزرے تو پُل باندھ کے
موج چشم عاشقاں دے توڑ پل میں پل کے پُل

۳. قتل کا کس کے کیا ہے آج ان آنکھوں نے عزم
کھینچ کر تیغے رہے ہیں ابرو اس قاتل کے تُل

۴. عہد میں تجھ حسن کے جس کو ہوا ہے شغل عشق
بج رہی ہے شرق سے تا غرب اس شاغل کے غُل

۵. حل مشکل کس سے ہو سودا کی شاہا تجھ بغیر
کھول دے مشکل کشا عقدے مری مشکل کے کُل

کون ہے جو ان مثالوں کے بعد بھی سودا کو صنایع بدایع کا دلدادہ نہ کہے گا۔ سودا کے کلام میں صنایع بدایع کی تمام اقسام پائی جاتی ہیں۔ لیکن اس مقام پر ہم ان تمام اقسام کو پیش کرنا مناسب نہیں سمجھتے۔

آئیے۔ اب ذرا میر تقی میر کے اس دعوے کو پرکھیں۔ کہ

کیا جانیں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں

میر نے کہا ہے۔ کہ میرے کلام میں "ایہام بھی نہیں"۔ اس لیے ہم پہلے صرف ایسے اشعار پیش کرتے ہیں۔ جو میر کے اس دعوے کی تردید کریں۔ اور پھر دوسرے صنایع بدایع کی مثالیں پیش کریں گے۔

یہ عجیب بات بھی یاد رکھئے کہ میر نے صنایع بدایع کے استعمال کو صرف جائز ہی نہیں سمجھا۔ بلکہ اسے پسند بھی کیا ہے۔ نکات الشعراء میں شاعری کی قسمیں گنواتے ہوئے لکھتے ہیں ص۱

"۔۔۔ ششم انداز است کہ ما اختیار کردہ ایم و آں محیط
ہم صنعت ہاست، تجنیس، ترصیع، تشبیہ، صفائے گفتگو، فصاحت و بلاغت"

میر کے کلام سے ایہام کی مثالیں ص۲

۱۔	تھا مستعار حسن سے اس کے جو نور تھا	خورشید میں بھی اس کا ہی ذرہ ظہور تھا
۲۔	کہا میں نے کتنا ہے گل کو ثبات	کلی نے یہ سن کر تبسم کیا
۳۔	بہار رفتہ پھر آئی ترے تماشے کو	چمن کو یمن قدم نے ترے نہال کیا
۴۔	چمن میں گل نے جو کل دعویٰ جمال کیا	جمال یار نے منہ اس کا خوب لال کیا
۵۔	شاید کسو کے دل کو لگی اس گلی میں چوٹ	میری بغل میں شیشۂ دل چور ہو گیا
۶۔	تیرا ہی منہ تکے ہے کیا جانیے کہ تو خط	کیا باغ سبز تو نے آئینے کو دکھایا

ص۱: نکات الشعراء (میر) مرتبہ عبدالحق صفحہ ۱۷۹ و ۱۸۰۔

ص۲ ا۔ ان مثالوں میں سے اکثر ایسی مثالیں ہیں۔ جو بحر الفصاحت اور دیگر کتب بلاغت میں بھی بطور مثال لکھ کر پیش کی گئی ہیں۔

ب: ان اشعار میں سے بعض اشعار میں ایہام کے علاوہ صنایع بدایع کی اور قسمیں بھی ہیں۔

۷۔ آخر کو مرگئے ہم اس کی ہی جستجو میں   جی کے تئیں بھی کھویا لیکن اُسے نہ پایا

۸۔ ہونا تھا مجلس آرا اگر غیر کا تجھے تو   مانند شمع مجھ کو کاہیکو تیں جلایا

۹۔ خوبی کا اُس کی بسکہ طلبگار ہو گیا   گل باغ میں گلے کا مرے ہار ہو گیا

۱۰۔ جو یہ دل ہے تو کیا سر انجام ہوگا   تہ خاک بھی خاک آرام ہوگا

۱۱۔ ہونا نہ چار چشم دل اُس ظلم پیشہ سے   ہشیار، زینہار، خبردار، دیکھنا

۱۲۔ بس اے گریہ آنکھیں تری کیا نہیں ہیں   کہاں تک جہاں کو ڈبوتا رہے گا

۱۳۔ کیا ہے گلشن میں جو قفس میں نہیں   عاشقوں کا جلا وطن دیکھا

۱۴۔ تھی لاگ اس کی تیغ کو ہم سے سو عشق نے   دونو کو معرکے میں گلے سے ملا دیا

۱۵۔ تب گرم سخن کہنے لگا ہوں میں کہ اک عمر   جوں شمع سر شام سے تا صبح جلا ہوں

۱۶۔ ہم کو مرنا ہے یہ کہ کب ہوں کہیں   اپنی قید حیات سے آزاد

۱۷۔ بھولے بھی پوچھتے نہیں ٹک حال آن کر   انجان اتنے کیوں ہوئے جاتے ہو جان کر

۱۸۔ موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تو   جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا

ایہام کی مذکورہ بالا مثالیں صرف میر کے پہلے دیوان سے لی گئی ہیں۔ اگر اس غرض سے اس کے تمام دواوین کا مطالعہ کیا جائے۔ تو بیسیوں اور مثالیں ایہام کی جمع کی جاسکتی ہیں۔ ایہام کے علاوہ میر کے کلام میں دوسرے صنایع بدایع بھی کثرت سے ملتے ہیں۔ ہم نے میر کے پہلے دیوان کے چند صفحات سرسری نظر سے دیکھے ہیں۔ اور متعدد صنایع بدایع نظر آئے ہیں۔

۱۔ کیا جانوں دل کو کھینچے ہیں کیوں شعر میر کے
کچھ طرز ایسی بھی نہیں ایہام بھی نہیں   (صنعت تجاہل عارفانہ اور تعجب)

۲۔ مدت ہوئی کہ بیچ میں پیغام بھی نہیں
نامے کا اُس کی مہر سے اب نام بھی نہیں   (صنعت تجنیس زائد و ناقص)

۳۔ ایام ہجر کریے بسر کس امید پر
ملنا انہوں کا صبح نہیں شام بھی نہیں

(صنعت طباق یا تضاد)

۴۔ پرواہ اُسے ہو کاہے کو ناکام گر مروں
اُس کام جاں کو مجھ سے تو کچھ کام بھی نہیں (تجنیس تام اور اشتقاق)

۵۔ رو ویں اس اضطراب دل کو کہاں تک
دن رات ہم کو ایک دم آرام بھی نہیں (طباق یا تضاد)

۶۔ ہنگامہ گرم کن جو دلِ ناصبور تھا
پیدا ہر ایک نالے سے شور نشور تھا (تجنیس زاید و ناقص)

۷۔ یاں کے سپید و سیہ میں جو دخل ہے ہم کو تو اتنا ہے
شام کو رو رو صبح کیا اور صبح کو رو رو شام کیا (تضاد تکرار عکس)

۸۔ موجیں کرے ہے بحر جہاں میں ابھی تو تُو
جانے گا بعد مرگ کہ عالم حباب تھا (تجنیس اور مراعات النظیر)

۹۔ جامۂ احرام زاہد پر نہ جا
تھا حرم میں لیک نامحرم رہا (اشتقاق)

۱۰۔ پشت پا ماری بسکہ دنیا پہ
زخم پہ پڑ گیا معرے پا پہ (تجنیس تام اور تجنیس خطی)

۱۱۔ جھوٹے بھی پوچھتے نہیں ٹک حال آن کر
انجان اتنے کیوں ہوئے جاتے ہو جان کر (ایہام اور اشتقاق)

۱۲۔ تنگے بھی تم ٹھہرتے کہیں دیکھے ہیں تنک
چشم وفا نہ رکھو خسانِ جہاں سے تم
(ایہام اور تجنیس زاید و ناقص)

۱۳۔ آؤ یادِ بتاں پہ بھول نہ جاؤ
یہ تغافل شعار ہوتے ہیں (طباق یا تضاد)

۱۴۔ یہ جو چشم پر آب ہیں دونو
ایک خانہ خراب ہیں دونو (صنعت جمع)

۵۔ ایک سب آگ ایک سب پانی
دیدہ و دل عذاب ہیں دونو (صنعت تفریق)

ہم صنایع بدایع کی انہی مثالوں کو کافی سمجھتے ہیں۔ میر کے سامنے دیوان صنایع بدایع سے بھرے ہوئے ہیں۔ ان مثالوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ باوجود صنایع بدایع اور ایہام کے منکر ہونے کے قدما کے دوسرے دور کے ان مشہور بزرگوں کے کلام میں صنایع بدایع کثرت سے ہیں۔

انشا اور مصحفی کا زمانہ

میر و سودا کے زمانے کے بعد اردو شاعری میں مصحفی، جرأت اور انشا کا زمانہ آیا۔ اس زمانے میں شاعرے اور شعر گوئی کے مقابلے خوب ہوتے اور ظاہر ہے کہ مشاعروں، مناظروں اور شعر گوئی کے مقابلوں اور سخن فہموں کی آفرین سے شاعری کو خصوصاً اور زبان و ادب کو عموماً فائدہ پہنچتا ہے۔ کیونکہ بحث و مباحثہ اور تنقید و تنقیص سے ایسے ایسے نکات سامنے آتے ہیں جن کی طرف بسا اوقات شاعر کی توجہ نہیں جاتی۔ ان بزرگوں کے شعری مقابلوں سے زبان و ادب کو جو ذخیرہ ملا۔ اس پر بحث کرنا یا تبصرہ کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ ہم صرف یہ دیکھیں گے کہ مصحفی، جرأت اور انشا کے کلام میں صنایع بدایع کو کیا مقام حاصل ہے۔ پہلے مصحفی کے کلام دیکھئے۔

۱۔ ہوں تو گھنگھری پون کی مثل حباب
لیکن آب و ہوا کے ہاتھ میں ہوں

(ایہام اور ردّ العجز علی الصدر)

۲۔ اُس گل کی باغ میں جو چلائی صبا نے بات
غنچہ نے مسکرا کے کہا ہم نے پائی بات (مراعات النظیر)

۳۔ شہرت بزیر آسمان رکھتی تھی حاتم کی سخا
اُس کا نہیں نام و نشان کیا جانے وہ کیدھر گئی (تلمیح اور مسمط)

۴۔ گر یاز مین کربلا تھی قتل گاہ عاشقاں
جو بدلی آئی اس طرف یاراں بچشم تر گئی (تضاد اور ایہام)

۵۔ دن جوانی کے گئے موسم پیری آیا

آبرو خواب ہے اب وقت حقیری آیا (تضاد)

۶۔ سبق نالہ تو بلبل نے پڑھا مجھ سے ولے

نہ اسے قاعدہ تازہ ضمیری آیا (مراعات النظیر)

۷۔ پوچھ مت معرکۂ عشق کا ہنگامہ کہ واں

قیس مارا گیا وامق باسیری آیا (تلمیح اور تضاد)

۸۔ بس کے گرم نالے جب سے ہیں اس نے

دیوار گلستاں پر بولے ہے زاغ ٹھنڈا (ایہام تضاد)

۹۔ بسوال بوسہ اس نے مجھے رک کے دی جو گال

ہیں ادب کے مارے اس کو نہ دیا جواب الٹا (ایہام)

۱۰ کہیں چشم مہر اس پر تو نہ پڑ گئی ہو یارب

جو نکلتے صبح گھر سے وہ پھر اشتاب الٹا (ایہام)

۱۱۔ اک تو تھا آتش سوزاں بدن سرخ ترا

شعلہ بر شعلہ ہوا پیرہن سرخ ترا (تجرید)

۱۲۔ باغ وہ دشت جنوں تھا کہ کبھی جس میں سے

لالہ و گل گئے ثابت نہ گریباں لے کر (حسن التعلیل)

۱۳۔ تری مژگاں کی رادت چڑھ گئی جب ان پہ لڑنے کو

پڑی پورنہ کے اندر کھلبلی سارا دکن بگڑا (مشاکلہ)

۱۴۔ مری تپش نے اشک خیرہ سر کو

بنایا ہے ہتھیلی کا پھپھولا (ایراد المثل)

اب جرأت کے کلام کو دیکھئے۔ یہ غزل صنعت التزام میں لکھی گئی ہر شعر کے دوسرے مصرعے میں تین تین بار ایک ہی چیز کے تکرار کا التزام کیا گیا ہے۔

۱۔ امشب کسی کاکل کی حکایات ہے واللہ ص۱

کیا رات ہے کیا رات ہے کیا رات ہے واللہ

۲۔ دل چھین لیا اس نے دکھا دست حنائی

کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

۳۔ عالم ہے جوانی کا جو ابھرا ہوا سینہ

کیا گات ہے کیا گات ہے کیا گات ہے واللہ

۴۔ دشنام کا پایا جو مزا اُس کے لبوں سے

صلوات ہے صلوات ہے صلوات ہے واللہ

۵۔ جرأت کی غزل جس نے سنی اس نے کہا واہ

کیا بات ہے کیا بات ہے کیا بات ہے واللہ

جرأت کے کلام میں ایہام بھی ہے۔ اور دوسرے صنایع بدایع بھی۔ ہم یہاں صرف ایہام کے چند شعر درج کرتے ہیں۔

۱۔ اس ابر میں پاؤں ہیں کہاں دختر رز کو
رہتی ہے مدام اب تو وہ بدذات کہیں اور

۲۔ جا کے پھر آؤں نہ جاؤں اُس گلی میں دوڑ دوڑ
پر کروں کیا میں نہیں پھرتا ہے دل آیا ہوا

۳۔ بھلا پھر اُس کے اٹھانے میں کیوں نہ دیر لگے
کسی کی موت کسی کے جو انتظار میں آئے

۴۔ ہر چند ہے بہ لطف شب ماہ سیر باغ
اندھیر پہ یہی ہے کہ وہ ماہ جبیں نہیں

اب انشار کا کلام دیکھئے۔ انشار ہر قسم کی صناعی میں مشتاق تھا۔ اس نے نثر ایسی لکھی ہے جس میں

ص۱۔ بعض دواوین میں یہ مصرع یوں ہے۔ امشب تری زلفوں کی حکایات ہے واللہ

عربی فارسی کا ایک لفظ بھی آنے نہیں دیا۔ اس کے اشعار تجرید کی صنعت کا نمونہ ہیں۔ انشا کو عربی فارسی کے علاوہ ہندوستان کی اور کئی بولیاں بھی آتی تھیں۔ ان بولیوں کو بھی اس نے نظم کیا ہے۔ پنجابی زبان میں شعر کہے ہیں۔ ریختی کے رواج کو عام کرنے والوں میں سے ایک انشا ہے۔ اصناف سخن میں سے کوئی صنف ایسی نہیں جس میں انشا نے طبع آزمائی نہ کی ہو۔ صنایع بدایع کی تمام مثالیں انشا کے کلام میں ملتی ہیں۔ مگر ہم صرف چند مثالوں پر اکتفا کرتے ہیں۔

اعداد کا کلام میں لانا صنعت سیاق الاعداد کہلاتا ہے کوئی بھی شاعر کلام میں دو چار اعداد سے زیادہ عدد اپنے کلام میں نہیں لاسکا۔ انشا نے ایک غزل میں دس تک اعداد کا التزام کیا ہے۔ فن بلاغت کی تمام کتابوں میں صنعت سیاق الاعداد کی مثالوں میں انشا کے یہ اشعار ہر مؤلف نے پیش کیے ہیں۔ اب وہ غزل دیکھئے۔

۱۔ میں جو شب ان سے راہ میں پٹا — بیم حاکم رہا نہ خوف عسس

۲۔ ہاتھا پائی ہوئی کچھ ایسی پھر — ان کی انگلی کی چڑھ گئی جھٹ نس

۳۔ لگی کہنے زمیں سے دامن کو — نہیں اب تک کیا کسی نے مس

۴۔ مفت جل جائے گا پرے بھی سرک — ارے میں آگ اور تو ہے خس

۵۔ جب یہ دیکھا کہ چھوڑتا ہی نہیں — تب تو ٹھہری کہ بوسے دیں گے دس

۶۔ گن کے سونے لے گیارھواں نہ ہی — مجھے پڑے کرے جو اور ہوس

۷۔ ایک دو تین چار پانچ چھ سات — آٹھ نو دس ہوئے بس انشا بس

انشا کی افتاد طبع کا تو صرف اسی غزل سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ صنعت گری کو کس قدر عزیز جانتا تھا۔ لیکن آپ اس کے چند اشعار اور دیکھئے جن میں ہر قسم کے صنایع بدایع ہیں۔

۱۔ یہ نہیں برق اک فرنگی ہے
رعد و باراں قشون جنگی ہے (مشاکلہ)

۲۔ حوصلہ ہے فراخ رندوں کا
خرچ کی پر بہت سی تنگی ہے (صنعت تضاد یا طباق)

۳۔ شیخ سعدی وقت ہے انشا
تو ابوبکر سعد زنگی ہے (صنعت مقابلہ)

۴۔ ہے یہ اُس ماہ جبیں کی تصویر
یا کسی حورِ حسین کی تصویر (صنعت تجاہلِ عارفانہ اور تعجب)

۵۔ دیکھ لے اُس کی چینِ پیشانی
ہے یہ خاقانِ چین کی تصویر (تجنیس تام)

۶۔ مغلسا بیگ جو عاشق ہیں کہاں پاویں زر
زر ہو اس پاس جو پارے کی رسا تن مائے (افعال البعیر)

ایک غزل کے چار شعروں میں صنعت قلب پیدا کی گئی ہے۔ آپ ایسے دو دو لفظ دیکھیں گے کہ ایک کے قلب یعنی ایک کے الٹنے سے دوسرا لفظ بن جاتا ہے۔

۷۔ مجھے کیوں نہ مارڈالے تری زلف الٹ کے کافر
کہ سکھا رکھا ہے تو نے اسے لفظ رام الٹ

۸۔ سحر ایک ماش پھینکا جو مجھے دکھا کے اُس نے
تو اشارہ میں نے تاڑا کہ ہے لفظ شام الٹا

۹۔ جو تو باتوں میں رکے گا تو میں جانوں گا کہ سمجھا
مرے جان و دل کے مالک نے مرا کلام الٹ

۱۰۔ فقط اس لفافہ پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے
تو لکھا ہے اُس نے انشا یہ ترا ہی نام الٹ

انشاء کے متعلق ہر تنقید نگار نے لکھا ہے کہ اس نے شاعری کو الفاظ کی شعبدہ بازی بنا دیا۔ شاعری ان کے لیے ذریعہ معاش تھی ان کا کوئی اعلیٰ مطمع نظر نہ تھا۔ ان کا کوئی پیغام نہ تھا۔ جو زبانِ شعر سے لوگوں تک پہنچاتے۔ سید انشاء اور ان کی شاعری کے متعلق میاں بیتاب کا یہ چبھتا ہوا جملہ یاد رکھنے کے قابل ہے۔ کہ انشاء کے علم و فضل کو ان کی شاعری نے کھویا اور ان کی شاعری کو درباداری نے ڈبویا[۱] مولانا آزاد نے انشاء کے متعلق لکھا ہے "ایسا طباع اور عالی دماغ آدمی ہندوستان میں کم پیدا ہوا ہوگا۔ طبیعت ایک میوے

---

[۱]: تاریخ ادب اردو (ترجمہ عسکری) صفحہ ۱۸۵

تھی۔ کہ ہر قسم کی صورت پکڑ سکتی تھی ؎۱۔ انشاء کے کلام پر رائے دینا ہمارے موضوع سے باہر ہے۔ ہم صرف یہ کہنا چاہتے ہیں کہ انشاء لفظی صنعت گری میں اپنی مثال آپ ہے۔

اس زمانے میں کہ جسے انشاء اور مصحفی کا دور کہا جاتا ہے لفظی صنعت گری نے بہت زور پکڑا۔ اور صنایع بدایع کو کلام کی جان سمجھا جانے لگا۔ اور اس صنعت گری کو رواج دینے اور اسے عام کرنے میں انشاء کا سب سے زیادہ حصّہ ہے۔

ناسخ اور آتش کا زمانہ

انشاء اور مصحفی کے دور کے بعد ناسخ اور آتش کا زمانہ آیا۔ اس دور میں ناسخ، آتش، میر خلیق اور شاہ نصیر دہلوی مشہور زمانہ ہوئے۔ شاہ نصیر دہلوی مشکل زمینوں میں شعر لکھنے کے لیے مشہور ہیں۔ ان کے کلام کی بنیاد زیادہ تر تصنع پر ہے۔ مگر ہم اپنے موضوع کی وضاحت کے لیے صرف ناسخ اور آتش کے کلام پر ہی تبصرہ کریں۔

ناسخ کے شعروں میں صنایع بدایع دیکھئے،

۱۔ مسی مالیدہ لب پر رنگ پاں ہے
تماشا ہے نہ آتش دھواں ہے (صنعت تعجب)

۲۔ کوئے جاناں میں ہوں پر محرم ہوں دیدار سے
پائے خفتہ خندہ زن ہیں دیدۂ بیدار پر (ایہام تضاد)

۳۔ سب زمینیں ہیں نئی بیتیں ہیں اے یار نئی
روزیاں ریختے کی اٹھتی ہے دیوار نئی (ایہام)

۴۔ مجھ کو بیگانہ سمجھے ہے ظالم
راہ چلتے کو آشنا سمجھے
(طباق یا تضاد)

؎۱ : آب حیات (پندرھواں ایڈیشن) صفحہ ۲۵۵

۵۔ عشق جب کامل ہوا ہے عین حسن
آگ میں پڑ جائے جو شے آگ ہے (مذہب کلامی)

۶۔ جز قتل کیا ہے عشق کے بیمار کا علاج
سو آپ روز کرتے ہیں دو چار کا علاج (تاکید الذم بما یشبہ المدح)

۷۔ جی لیتی ہے وہ زلف سیہ فام ہمارا
بجھتا ہے چراغ آج سر شام ہمارا (ایہام)

۸۔ نہ سجدۂ در جاناں سے سر اٹھاؤں گا
یہ وہ نماز ہے جس کا کبھی سلام نہیں (مراعات النظیر)

۹۔ تنکے چنتے ہیں تری راہ میں گلچیں اے گل
تیرے کوچے میں ہزاروں کو چمن بھول گئے (ایہام اور مراعات النظیر)

۱۰۔ غم دیا، رنج دیا، درد دیا، داغ دیا
ہو سکے مجھ سے عوض کیا ترے احسانوں کا (جمع)

۱۱۔ چلا عدم سے میں جبراً تو بول اٹھی تقدیر
بلا میں پڑنے کو کچھ اختیار لیتا جا (حسن تعلیل اور تضاد)

۱۲۔ گلعذاروں کی جو محفل میں گیا وہ گلرو
ہو گئے زرد جو دو چار تو دو چار سفید (تدبیج)

۱۳۔ دور سے دیکھی جھلک جو عارض پُر نور کی
بام جاناں پر نظر آئی تجلی طور کی (تجرید)

۱۴۔ کچھ تری بات کو ثبات نہیں
ایک ہاں ہے تو پانچ سات نہیں

(ایہام تضاد، سیاق الاعداد اور تجنیس)

۱۵۔ وصل میں تھا صبح سے بیزار میں
ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح (رد العجز علی الحشو)

۔ کلام میں ایہام اور دیگر صنایع بدایع کی بے شمار مثالیں ہیں۔ صنایع بدایع کی اس کثرت کی بنا پر ہم ناسخ کو بھی انشا کی مانند سمجھتے ہیں۔ انہوں نے بھی الفاظ کو خیال اور معانی پر ترجیح دی ہے۔ اب آتش کے کلام کو دیکھئے۔ آتش بھی زیادہ تر بندش الفاظ کی طرف توجہ دیتے ہیں اور بندش الفاظ کو ہی شاعری خیال فرماتے ہیں۔ خود اعتراف کرتے ہیں کہ

بندشِ الفاظ جڑنے سے نگوں کے کم نہیں
شاعری بھی کام ہے آتش مرصع ساز کا

اب اُن کے اِن اشعار میں صنایع بدایع دیکھئے:۔

۱۔ کہتے ہیں ذکرِ لیلیٰ و مجنوں جو چھیڑیے
چپ رہیے بس نہ قبر کے مردے اکھیڑیے (ایہام اور تلمیح)

۲۔ کوچہ دلبر میں میں بلبل چمن میں مست ہے
ہر کوئی یاں اپنے اپنے پیرہن میں مست ہے (تفریق)

۳۔ وحشتِ مجنوں و آتش میں ہے بس اتنا ہی فرق
کوئی بن میں مست ہے کوئی وطن میں مست ہے (تفریق)

۴۔ بہت شور سنتے تھے پہلو میں دل کا
جو چیرا تو اک قطرہ خون نہ نکلا (محتمل الضدین)

۵۔ طبل و علم ہی پاس ہے اپنے نہ تاج و تخت
ہم سے خلاف ہو کے کرے گا زمانہ کیا (مراعات النظیر)

۶۔ اڑتا ہے شوق راحت منزل میں اسپ عمر
مہمیز کس کو کہتے ہیں اور تازیانہ کیا (مراعات النظیر)

۷۔ خضر و مسیح کاٹتے ہیں رشک سے گلا
تو بھی تو کر شہیدوں کی اپنے زیارتیں (ایہام و تلمیح)

۸۔ عاشق اس غیرت بلقیس کا ہوں میں آتش
بام تک جس کے کبھی مرغ سلیماں نہ گیا (مشاکلہ اور تلمیح)

۹۔ زیر زمیں سے آتا ہے جو گل سو زر بکف
قاروں نے راستے میں لٹایا خزانہ کیا (حسن التعلیل)

۱۰۔ دل دے کے بوسۂ لب لعلیں کیا خرید
بازار عشق میں یہی آکر لیا دیا (صنعت طباق یا تضاد)

آتش کے کلام میں ناسخ کی بہ نسبت صنایع بدایع کم ہیں۔ لیکن جیسا کہ ہم اوپر کہہ چکے ہیں۔ آتش بھی صنایع بدایع سے بے نیاز نہ تھا۔ اس کی نظر بھی معانی کے ساتھ ساتھ عمدگی الفاظ پر رہتی تھی۔ کیونکہ ان کے دور میں تصنع، تکلف اور رعایت لفظی ہی شاعری کی جان سمجھی جاتی تھی۔

غالب اور ذوق کا زمانہ

ناسخ اور آتش کے بعد ذوق، مومن اور غالب کا زمانہ آیا۔ دلی میں سلطنت مغلیہ کا آخری چراغ ٹمٹما رہا تھا۔ ابوظفر بہادر شاہ اگرچہ شاہ شطرنج کی مانند تھے۔ اور برائے نام بادشاہ تھے۔ لیکن ان میں ایک خوبی یہ تھی کہ شاعر تھے۔ سخن فہم تھے۔ سخن سنج اور سخن پرور تھے۔ دوسری بڑی خوبی یہ تھی کہ شعراء کے مربی تھے اور محدود آمدنی کے باوجود داد و دہش میں اپنے آباو اجداد کی مانند تھے۔ یہ ایک مسلم امر ہے۔ کہ شاعری شاہانہ قدردانی کے سایہ میں زیادہ ترقی کرتی ہے۔ یہ زمانہ بھی اس لحاظ سے شاعری کی ترقی کا زمانہ ہے۔ ذوق استادِ شہ تھے۔ غالب قدر افزائی کے طالب تھے مومن بھی شاہانہ عنایات کے خواہاں۔ اس لیے یہ بھی مقابلے اور مسابقت کا زمانہ تھا اور شاعری ایسے ہی زمانے میں ترقی پاتی ہے۔ چنانچہ غزل، قصیدہ اور مثنوی اسی دور میں اپنے منتہائے کمال تک پہنچے۔

ذوق غالب کے ہمسر اور حریف تھے اور ظفر غالب کے ممدوح اور قدردان۔ اس لیے ہم ذوق اور ظفر کے کلام پر تبصرہ کرتے ہوئے دیکھیں گے۔ کہ ان کے کلام میں تصنع اور تکلف کو کتنا دخل ہے۔

ذوق نے قصیدہ گوئی میں بڑا نام پایا ہے۔ بادشاہ نے خاقانیِ ہند کا خطاب دیا۔ ذوق کے قصاید فن کے لحاظ سے بہت اعلیٰ پائے کے ہیں۔ لیکن قصاید میں ہے کیا صرف صنعت اور الفاظ۔ ذوق پر شاہ نصیر دہلوی کا بہت اثر ہے۔ اور شاہ نصیر دہلوی بڑے بلند پایہ صنعت گر تھے۔ بڑی مشکل زمینوں میں شعر لکھتے تھے۔ ردیف و

قوافی ایسے اختیار کرتے تھے کہ جن میں ایک عام شاعر کا قافیہ تنگ ہوجائے ذوق پر دوسرا اثر ناسخ کا ہے ناسخ کے متعلق ہم اوپر بیان کر آئے ہیں۔ کہ لفظی صناعی پر جان دیتا تھا۔ ان اثرات کے تحت ذوق بھی لفاظی کی طرف زیادہ مائل تھے۔

غزل میں ذوق نے یہ جدت کی ہے کہ محاوروں کو زیادہ استعمال کیا ہے۔ غالب نے اپنے سارے اردو کلام میں مشکل پانچ چھ محاورے استعمال کئے ہیں۔ لیکن ذوق کے اکثر اشعار میں محاورات کا استعمال ہے۔ یہی حال صنایع بدایع کا ہے۔ مندرجہ ذیل اشعار ملاحظہ کیجئے:۔

١۔ یوں تن خاکی میں روشن دل ہمارا ہو گیا
جس طرح پانی کنوئیں کی تہ میں تارا ہو گیا (ایہام)

٢۔ زخم میرا ہے وہ ایذا دوست خوں ہٹنے لگے
منہ سے گر جراح کے سن پائے نام انگور کا (ایہام)

٣۔ اے آفتاب تیرے رخ تابناک سے
کیا کیا چمک رہا ہے ستارا حباب کا (ایہام)

٤۔ جو نہ رنگ رنج و ماتم کا یہاں نمود ہوتا
تو زمیں نہ زرد ہوتی نہ فلک کبود ہوتا (حسن تعلیل اور تدبیج)

٥۔ چرخ پر بیٹھ رہا جان بچا کر عیسےٰ[ا]
ہو سکا جب نہ مداوا ترے بیماروں کا (حسن التعلیل)

٦۔ آ اے مرے چمن کے گل داد دیکھ لے
عاشق کا رنگ زرد زرد ہوگیا
(تجنیس زاید و ناقص اور تدبیج)

٧۔ پیر مغاں کے پاس وہ دارو ہے جس سے ذوق
نامرد مرد، مرد جواں مرد ہوگیا (تکرار متتابع)

[ا] : دیوان ذوق کے بعض نسخوں میں یہ مصرع یوں ہے ؎ چڑھ گئے چرخ چہارم پہ جناب عیسیٰ۔

۸. ابھی جلوہ ہے حسن بت کا آج مسجد میں
کہ دم سجود ہے موذن جدا خطیب جدا (مراعات النظیر اور تفریق)

۹. کہا جی نے مجھے یہ ہجر کی رات
یقین ہے صبح تک دیگی نہ جینے (تجنیس مرکب)

۱۰. شمیم عیش سے ہے یہ زمانہ عطر آگیں
کہ قرص عنبر اگر ہے زمیں تو گرد عبیر (تجنیس خطی)

۱۱. مارے گر سیلی وہ زلف پر عرق
جھڑ پڑیں دندان دہان مار کے (تجنیس زاید و ناقص)

۱۲. چشم غضب سے نیم نگہ میرے واسطے
اک نیمچہ ہے زہر میں گویا بجھا ہوا (تجنیس مذیل)

۱۳. عقل میں شمس ہے تو علم میں کان گوہر
فضل میں کعبہ ہے تو حلم میں کوہ رحمت (تجنیس مضارع)

۱۴. یہ بھی اُس نازک بدن کو بار ہو
گر کمر باندھے نظر کے تار سے (تجنیس لاحق)

۱۵. مانگ سے اس کی مانگتی ہے بھیک
مہ کا کاسہ لیے شب تاریک (تجنیس مذیل)

۱۶. کبھی ہمت تھی مری قاعدہ صرف میں صرف
کبھی تھی نحو میں ہر نحو مجھے محویت (تجنیس تام)

غور کیجئے کہ شعر ۹ سے شعر ۱۶ تک تجنیس کی تقریباً تمام قسمیں آگئی ہیں، اور بعض شعر ایسے ہیں کہ ان میں سوائے اس صنعت کے اور کوئی خوبی نہیں۔

۱۷. بخار ارض سے تا ابر ہو اور ابر میں پانی
روان پانی سے تا دریا ہو اور دریا میں طغیانی

۱۸. تری شمشیر جو ہر وار میں نصرت کا جوہر ہو
ترے قبضے میں بحر پر گہر ہو کان پر زر ہو

(تکرار قافیہ)

۱۹۔ وہ شہنشاہِ بہادر شہِ کسریٰ انصاف
خسرو جم حشم دداور داراحشمت
۲۰۔ قوت ملت ودیں قامع کفر دالحاد
حامی شرع متیں ماحی شرک وبدعت
(صنعت تنسیق الصفات)

۲۱۔ جھینپی رنگ کا وہ اپنے دکھا کر عالم
ایک عالم کا ہو دل لیکے بغل میں جھینپت
(ارد العجز علی الصدر مع الاشتقاق)

۲۲۔ اگر ہے سہو کو کچھ دخل حافظے میں تو یہ
نہ اپنا یاد ہے احساں نہ اور کی تقصیر
(صنعت استدراک)

۲۳۔ نگہ کیا اور مژہ کیا ہم تو دو کو بلا سمجھے
اسے تیر قضا اُس کو پر تیر قضا سمجھے
(جمع وتفریق)

۲۴۔ بے شکایت نہیں اپنے ذوق محبت کے مزے
بے محبت نہیں لے ذوق شکایت کے مزے
(عکس)

۲۵۔ قوت ملت ودیں قامع کفر دالحاد
حامی شرع متیں ماحی شرک وبدعت
(صنعت قلب مقلوب بعض)

ذوق کے قصاید اور غزلیات میں صنایع بدایع کی تمام مثالیں کثرت سے ملتی ہیں۔ ذوق کے اکثر اشعار ایسے ہیں۔ جن کی ساری خوبی الفاظ میں ہے۔ اب ظفر کے کلام کو دیکھئے۔ کہ وہ اپنے استاد کی کس حد تک پیروی کرتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ ۱۸۵۷ء کے واقعات کے بعد ظفر کی شاعری درد وغم اور رنج والم کی تصویر ہے۔ اس پر آشوب دور میں ان کی زبان سے جو بات نکلتی ہے۔ تاثیر میں ڈوبی ہوئی ہے۔ لیکن یہ اشعار کلام ظفر کا عنصر عشیر ہیں۔ ان کا عام رنگ وہی ہے جس میں الفاظ کو معانی پر ترجیح دی گئی ہے۔ اُن کی اس غزل کو دیکھئے اس میں صرف لفظی صنعت ہے۔ کہ ہر شعر میں کسی نہ کسی طور سے پانچ پانچ چیزوں کو جمع کرنے کا التزام کیا گیا ہے:

۱۔ ہمیشہ کنج تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں۔
الم کو یاس کو حسرت کو بے تابی کو حرماں کو

۲۔ بگڑ بس کس کو دوں دل میں ترے ہاتھوں اے قاتل
کناری کو چھری کو بانک کو خنجر کو پیکاں کو

۳۔ لب و دنداں نے تیرے کر دیا بے قدر عالم میں
گہر کو لعل کو ہیرے کو یاقوت و مرجان کو

۴۔ نہیں تشنہ دھا دیتا ہے شیشہ و سبد و ساقی
سبو کو خم کو مے کو میکدہ کو مے پرستاں کو

۵۔ بنایا اے ظفر خالق نے کب انسان سے بہتر
ملک کو حور کو جن و پری کو اور غلماں کو

اب اس غزل کو دیکھئے۔ جس میں تقسیم مسلسل کی صنعت ہے۔

۱ تیر نگہ و مژگاں کیونکر نہ ہوں اب قاتل
یہ ناوک پراں ہے وہ خنجر براں ہے

۲۔ کیا کہئے دلا کیسا ہے اس کا دہن و قامت
یہ غنچہ شگفتہ ہے وہ سرو گلستاں ہے

۳۔ لخت دل و اشک اپنے آنکھوں سے رواں کب ہیں
یہ لعل بدخشاں ہے وہ گوہر غلطاں ہے

۴۔ زلف و رخ جاناں کا مت پوچھ ظفر مجھ سے
یہ ابر بہاراں ہے وہ برق درخشاں ہے

اب متفرق اشعار میں صنایع بدایع کو دیکھئے۔

۱۔ ہے تو انسان خاک کا پتلا
لیک پانی کا بلبلا دیکھا

(ایہام)

۲۔ نہ پوچھو دل کہاں پہنچا کسی کو کیا کہیں پہنچا
جہاں پہنچا نہ کوئی یہ وہیں پہنچا وہیں پہنچا (تکرار)

۳۔ دل کا کچھ کام نہ تجھ سے بُت پر فن نکلا
دوست جانا تھا تجھے جان کا دشمن نکلا (تجنیس زاید و ناقص)

۴۔ یاس و غم رنج و تعب میرے ہوئے دشمن جاں
اے ظفر شب انہی دو چار نے سونے نہ دیا (سیاق الاعداد)

۵۔ یہ ساری آمد و شد ہے نفس کی آمد و شد ہے
اسی تک آنا جانا ہے نہ پھر جانا نہ پھر آنا (عکس)

۶۔ جگر کے داغ پہ اشکوں کو ہم نے بیل دیا
کہ یعنی جلت نہیں ہے بغیر تیل دیا (تجنیس تام)

۷۔ آدمی کہتے ہیں جس کو ایک پتلا کل کا ہے
پھر کہاں کل اس کو گر کل ہو ذرا بگڑی ہوئی (تجنیس تام)

۸۔ ہو گئی پرسوں کی برسوں تم نہ آئے کیا سبب
آپ نے اچھا کیا وعدہ وفا اچھے تو ہو (تجنیس مضارع)

۹۔ دیکھ کر اس مہ کو وقت بے حجابی آفتاب
ہو گیا منہ پر بجائے آفتابی آفتاب (تجنیس زاید ناقص)

۱۰۔ جی جلائیں کیوں نہ میرا یہ بتان سنگ دل
دل ظفر ان کا ہے پتھر اور ہے پتھر میں آگ (صنعت متقابلہ)

۱۱۔ رات بھر مجھ کو غم یار نے سونے نہ دیا
صبح کو خوف شب تار نے سونے نہ دیا (مقلوب کل)

۱۲۔ نکالے ہیں یہ رشک گرم ہم نے
کہ چشم تر سے ہیں اخگر نکالے (رد العجز علی الصدر)

۱۳۔ جگر کے کرتے ہیں ٹکڑے یہ پارۂ الماس
پیے جو رشک کوئی مبتلا سمجھ کے پیے

(رد العجز علی الابتدا)

۱۴۔ تیری ہاں میں ہے نہیں اور نہیں میں ہے ہاں
تیرا اقرار نیا ہے تیرا انکار نیا (تضاد اور عکس)

۱۵۔ وہ بے حجاب جو کل پی کے یاں شراب آیا
اگرچہ مست تھا میں پر مجھے حجاب آیا (ردالعجز علی الصدر)

۱۶۔ آپ غصے ہوں تو خنجر مرے سر آنکھوں پہ
پر بشرطیکہ نہ ہو اور کسی کے باعث (استدراک)

۱۷۔ دل و مسجد یں دونوں گھر خدا کے فرق پر یہ ہے
وہ تعمیر اس کے ہاتھوں کی یہ تعمیر اپنے ہاتھوں کی (جمع و تفریق)

۱۸۔ روئے جو دل کھول کر ٹکڑے جگر ہونے لگا
اور اگر رونے کو روکا درد سر ہونے لگا (مزاوجہ)

۱۹۔ نماز فجر و مغرب ہے یہ عاشق کی کہ نت اٹھ کر
بلائیں اُس رخ و گیسو کی صبح و شام لیتا ہے (لف و نشر)

۲۰۔ ہوا ہے صورت دیوانہ گل گریباں چاک
چمن میں لائی صبا کس کے پیرہن کی بو (حسن التعلیل)

ظفر کی اکثر غزلوں میں موسیقیت کی وہ صورت ہے۔ جسے علم بدیع میں سجع یا مسمط کہتے ہیں۔ اس صنعت میں ظفر کی ایک مشہور غزل دیکھیے۔ یہ ان کے آخری ایام کا کلام ہے۔ اور سوز و گداز سے پُر ہے الفاظ کے ظاہری پردہ کے پیچھے جذبات کا تلاطم صاف نظر آ رہا ہے۔

۱۔ نہ کسی کی آنکھ کا نور ہوں نہ کسی کے دل کا سرور ہوں
جو کسی کے کام نہ آ سکے میں وہ ایک مشت غبار ہوں

۲۔ مرا رنگ روپ بگڑ گیا۔ مرا یار مجھ سے بچھڑ گیا
جو چمن خزاں سے اجڑ گیا میں اسی کی فصل بہار ہوں

۳۔ نہ تو میں کسی کا حبیب ہوں نہ تو میں کسی کا رقیب ہوں
جو بگڑ گیا وہ نصیب ہوں جو اجڑ گیا وہ دیار ہوں

۴۔ پسِ فاتحہ کوئی آئے کیوں کوئی چھول مجھ پہ چڑھائے کیوں
کوئی آکے شمع جلائے کیوں میں تو بیکسی کا مزار ہوں

۵۔ میں نہیں ہوں نغمۂ جانفزا، مجھے سن کے کوئی کرے گا
میں بڑے بروگ کی ہوں صدا میں بڑے دکھی کی پکار ہوں

گزشتہ صفحات میں ہم نے ولی، میر و سودا، مصحفی، جرأت، انشا، ناسخ و آتش، ذوق اور ظفر کے کلام پر ایک خاص زاویۂ نگاہ سے نظر ڈالی ہے۔ ذوق اور ظفر غالب کے ہم عصر تھے۔ ممکن ہے کہ ان کے کلام کا غالب پر بہت معمولی سا اثر ہوا ہو۔ لیکن میر و سودا کا غالب نے بہت سی غزلوں میں تتبع بھی کیا ہے۔ میر اور سودا کی زمینوں میں غزلیں لکھی ہیں۔ جو میر و سودا کے غالب پر اثر انداز ہونے کی دلیل ہیں۔ غالب کے یہ پیشرو اپنے اپنے اسلوب میں منفرد ہیں لیکن ایک بات ان سب شاعروں کے ہاں مشترک ہے۔ اور وہ ہے مناسبات لفظی یعنی صنایع بدایع۔ ہم اس مقام پر ڈاکٹر خورشید الاسلام کی رائے نقل کرتے ہیں۔ جو شعرا کے اس اشتراک پر قول فیصل کا حکم رکھتی ہے ؎۱

"یہ غزلیں ؎۲ مختلف شعرا کی ہیں۔ جو اپنی طبیعت، ماحول اور پرداخت کے لحاظ سے ایک دوسرے سے کافی فاصلہ رکھتے ہیں۔ یہ دو مختلف زبانوں میں ہیں۔ یہ مختلف تاریخی زبانوں کی پیداوار ہیں۔ لیکن اس کے باوجود ان میں یکسانیت ہے جو بڑی حد تک "مناسبات لفظی" کا نتیجہ ہے۔ یہ فنی خصوصیت جاگیرداری کے انحطاط سے مخصوص ہے۔ غالباً اس کا سبب یہ ہے کہ اس دور کے اہل فن زندگی کے مسلسل بہاؤ کو دیکھنے سے قاصر ہیں۔ اُن کے لیے زندگی نہ کوئی تصادم ہے اور نہ واقعہ۔ ان کی نگاہوں کے سامنے ایک ترشا ہوا بت ہے جس کے ہونٹ تو کھلتے ہوئے دکھائی دیتے ہیں۔ لیکن ان سے کوئی آواز نہیں نکلتی۔ ان کے چاروں طرف زندگی پھیلی ہوئی ہے لیکن یہ اسفنج کی طرح اپنے اندر رکھی ہوئی ہے۔ یہ نہ اپنے آپ بدلتی ہے اور نہ کسی کو بدلنے

؎۱ : غالب ابتدائی دور، مصنفہ ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ بار اول۔ صفحہ ۱۴۹

؎۲ : ڈاکٹر صاحب نے غنی کاشمیری، شوکت بخاری، جلال اسیر اور بیدل کی فارسی غزلوں اور ناسخ، میر، سودا کی اردو غزلوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔

میں مد دیتی ہے۔ اس کی ظاہری صورت کو برقرار رکھنے والی چیز "آداب" ہیں۔ جن سے "وضعداری" پیدا ہوتی ہے۔ "رسم و رواج" ہیں۔ جن سے انسانی رشتوں کا بھرم قایم رہتا ہے۔ "مناسبات لفظی" ہیں، جن سے شعر و سخن میں حُسن کا فریب پیدا ہوتا ہے اور ان سب کا سرچشمہ وہ "دربار" ہیں۔ جن کے دروازوں سے حرم کی دیوار دکھائی دیتی ہے یعنی اس زمانہ میں فن کا مقصد زندگی کی ترجمانی اور تنقید نہیں۔ "آداب" کی نقالی ہے"۔

"زندگی کی اسی بے تعلقی کی بنا پر اس دور کی غزلوں میں وہ نغمہ نہیں ملتا۔ جو بے شمار انسانوں کی رفاقت جدوجہد اور کسی اجتماعی مقصد کی لگن سے پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی تلافی "مناسبات لفظی" سے کر دی جاتی ہے۔ ان شعراء کا دارومدار "آداب" کی نقالی پر ہے — چنانچہ یہ ایسے الفاظ کو کام میں لاتے ہیں جو لغوی اور ظاہری صورت کے لحاظ سے ایک دوسرے کے حریف ہوں۔ اور اس اہتمام سے ان کی یہ غرض ہوتی ہے کہ سطحی آرائش سے معنویت کا فریب پیدا ہو جائے"۔

"کاریگری کی اس مسلسل مشق کے باعث یہ شعرا الفاظ پر حکومت کرنے کی بجائے ان کے محکوم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں "مضمون کی کاوش" "الفاظ کی ترتیب" میں بدل جاتی ہے۔ چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ معانی کے باہمی تعلق یا اختلاف کی بجائے، الفاظ کی باہمی نسبت، تجنیس، تضاد اور رعایتوں کو غیر ضروری اور غیر متناسب اہمیت حاصل ہو جاتی ہے۔ ان شاعروں کے ذہنی عمل میں یہ چیز خاص طور سے نمایاں ہے کہ یہ الفاظ کی مدد سے خیال کا شکار کرتے ہیں۔ چشم کے ساتھ "سُرمہ" "میل" اور اسی قبیل کے دوسرے الفاظ ان کے دماغ میں ہجوم کر لیتے ہیں۔ اور ان کی ترکیب سے خود بخود کوئی خیال ابھرتا ہے — یعنی ان کا فن سہولت پسندی اور کاہلی کے پیالہ سے ٹپکتا ہے۔ ان کے نزدیک "معانی" "الفاظ کی زمین کے خودرَو پودے ہیں اور "لفظی مناسبات" انسانی زندگی کے علائق کا بدل ہیں۔ ان شعراء نے الفاظ میں لذت اندوزی کا ایک پہلو دریافت کر لیا ہے اور ان کو یکجا کر دینے سے انہیں جمالیاتی تسکین حاصل ہو جاتی ہے...... چنانچہ ان کی شاعری "مناسبات لفظی" کا ایک ایسا شعبدہ ہے جو "انبساط" کی ایک ہلکی سی لہر بھی پیدا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتا..... غالب کی ابتدائی شاعری میں یہی رجحانات کارفرما نظر آتے ہیں۔

باب چہارم

غالب کی صناعی

انسان اپنے نطق اور ذہن کی وجہ سے اشرفِ مخلوقات ہے۔ ذہن کی ندرت وجودت ایک ایسا عطیۂ ایزدی ہے جسے موہبتِ کبریٰ خیال کیا جاتا ہے۔ بے شک صحت جسمانی ایک بڑی نعمت ہے۔ دولت بھی ایک بڑی نعمت ہے۔ مگر قوائے ذہنی کی سالمیت اور صحت سب سے بڑی نعمت ہے۔ یہ نعمتِ عظمیٰ ہے۔ کوئی اور نعمت اس کا مقابلہ نہیں کر سکتی۔ تاریخ عالم شاہد ہے۔ کہ دنیا میں جتنے بڑے بڑے نامور اور مشہور زمانہ لوگ ہو گزرے ہیں۔ انہیں جسمانی صحت کے ساتھ خدا نے قوائے ذہنی کا بہرۂ وافر بھی عطا کیا ہوا تھا۔ ذہنی قواہی ایک انسان کی دوسرے انسان پر یا ایک انسان کی اکثر انسانوں پر فضیلت کا باعث ہوئے ہیں۔

قدرت نے غالب کو ذہنی صلاحیتوں کا بہت زیادہ حصہ عطا کیا تھا۔ انہی صلاحیتوں کی وجہ سے وہ شعری ابداع و اختراع میں اپنے تمام اقران و امثال سے بہت آگے بڑھ گیا اور باوجود عسرت اور تنگ دستی کے دارالملکِ سخن میں فرمانروائی کرتا رہا ؎

زنجم گر بصورت از گدایاں بودہ ام غالب
بدارالملکِ معنی می کنم فرمانروائیہا

غالب نے بہت چھوٹی عمر میں مروجہ تعلیم حاصل کر لی۔ یہ بات بھی اس کے قوائے ذہنی

کی برتری پر دال ہے۔ اور بہت چھوٹی عمر میں شعر کہنا بھی شروع کر دیا۔ غالب کے اپنے قول کے مطابق اس نے دس برس کی عمر میں شعر گوئی شروع کی۔ چنانچہ دیوانِ فارسی کے خاتمے میں لکھتے ہیں:

"از روزے کہ شمارۂ سنین عمر از آحاد فرا ترک رفت
در رشتہ حساب یا زد ہمیں گرہ بخود برگرفت۔ اندیشہ در روائی
گام فراخ برداشت دگر یوہ ومغاک دبادیۂ سخن پیمودن آغاز نہاد۔"

اس سلسلہ میں مولانا حالی نے بھی یادگار غالب میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ جو بہت ہی حیران کن ہے۔ مگر اس سے غالب کے مندرجہ بالا بیان کی تصدیق ہوتی ہے۔ حالی لکھتے ہیں:

"لالہ کنھیا لال ایک صاحب آگرے کے رہنے والے جو مرزا صاحب کے ہم عصر تھے۔ ایک بار دہلی میں آئے، اور جب مرزا صاحب سے ملے تو اثنائے کلام میں اُن کو یاد دلایا کہ جو مثنوی آپ نے پتنگ بازی کے زمانے میں لکھی تھی۔ وہ بھی آپ کو یاد ہے۔ انھوں نے انکار کیا۔ لالہ صاحب نے کہا وہ اردو مثنوی میرے پاس ہے۔ چنانچہ اُنھوں نے وہ مثنوی مرزا کو لاکر دی وہ اس کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے...... لالہ صاحب کا بیان ہے کہ مرزا صاحب کی عمر، جب یہ مثنوی لکھی آٹھ نو برس کی تھی۔ (یادگار غالب صفحہ ۹۷)

یہ مثنوی دیوان غالب مرتبہ مالک رام میں موجود ہے اور یوں ہے:

۱	ایک دن مثل پتنگ کاغذی	لے کے دل سر رشتہ آزادگی
۲	خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا	اس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
۳	میں کہا اے دل ہوائے دلبراں	بسکہ تیرے حق میں رکھتی ہے زیاں
۴	بیچ میں ان کے نہ آنا زینہار	یہ نہیں ہیں گے کسو کے یار غار
۵	گورے پنڈے پر نہ کران کے نظر	کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
۶	اب تو مل جائے گی تیری ان سے سانٹھ	لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
۷	سخت مشکل ہوگا سلجھانا تجھے	قہر ہے دل اُن میں اُلجھانا تجھے
۸	یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے	بھول مت اس پر اڑاتے ہیں تجھے
۹	ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں	مفت میں ناحق کٹا دیں گے تجھے

۱۰ واں نے سن کر کانپ کر کھایا پیچ و تاب   غوطے میں جاکر دیا کٹ کر جواب

۱۱ رشتہ در گردنم افگندہ دوست

می برد ہر جا کہ خاطر خواہ دوست

نو دس برس کی عمر میں کسی بچے کا شعر کہنا ہی ناممکن سا نظر آتا ہے، چہ جائیکہ وہ ایک مسلسل مثنوی کہے۔ اس میں پتنگ بازی کی تمام اصطلاحات بیان کرے۔ اور کسی اور شاعر کے شعر کی تضمین بھی کرے۔ عقل حیران رہ جاتی ہے۔ اس مثنوی میں پتنگ بازی کی تمام اصطلاحات یوں نظم کی گئی ہیں جیسے لکھنے والا کوئی بڑا مشاق اور ماہر فن کار ہو۔ پتنگ کاغذی۔ کنیانا۔ ہوا پیچ۔ ڈورے ڈالنا۔ کاپنا۔ کانپ۔ غوطے میں جانا۔ کٹ جانا۔ کوئی اصطلاح باقی نہیں چھوڑی۔ اور آخر میں فارسی کا ایسا موزوں اور مناسب شعر لانا۔ یہ سب کچھ ہمارے لئے حیران کن ہے۔ اور اس بات کو جھٹلایا بھی نہیں جا سکتا۔ غالب کا اپنا بیان ہے کہ نو دس کی عمر میں شعر کہنا شروع کر دیا تھا۔ اور حالی سے بھی اتنا مبالغہ غیر متوقع ہے۔

اگر ہم اسے صحیح تسلیم کرتے ہیں تو یہ ماننا پڑے گا کہ غالب شعر میں لفظی صنعت پیدا کرنے کے ابتدا سے ہی سے قائل تھے۔

غالب اس صغر سنی میں فارسی میں بھی شعر کہنے لگے تھے۔ بلکہ ان کا مطالعہ اتنا وسیع تھا کہ اپنے الفاظ و محاورات کے جواز میں سند پیش کرنے کا سلیقہ بھی رکھتے تھے۔ چنانچہ یادگار غالب میں حالی نے ایک اور واقعہ کا ذکر یوں کیا ہے:

" اسی زمانے میں انہوں نے فارسی میں کچھ اشعار بطور غزل کے موزوں کئے تھے۔ جن کی ردیف میں "کہ چہ" بجائے "یعنی چہ" کے استعمال کیا تھا۔ جب انہوں نے وہ اشعار اپنے اُستاد شیخ معظم کو سنائے تو انہوں نے کہا کہ یہ کیا مہمل ردیف اختیار کی ہے۔ ایسے بے معنی شعر کہنے سے کچھ فائدہ نہیں۔ مرزا یہ سُن کر خاموش ہو رہے۔ ایک روز ملا ظہوری کے کلام میں ایک شعر[لہ] ان کی

لہ راقم الحروف نے ظہوری کا دیوان کھول کر وہ "ایک شعر" تلاش کرنا شروع کیا۔ جس میں "کہ چہ" "یعنی چہ" کے معنی میں استعمال ہوا ہے۔ میں یہ دیکھ کر حیران ہوا کہ ردیف ہ میں ایک شعر نہیں بلکہ دو غزلیں ظہوری کی "کہ چہ" کی ردیف کے ساتھ موجود ہیں۔ تعجب ہے کہ حالی جیسے عالم، شاعر، تنقید نگار اور مؤرخ نے "ایک شعر" کیوں لکھا ہے۔ ایک شعر سے یہ اشتباہ پیدا ہوتا ہے کہ اتفاقاً یا بڑی تلاش (باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

نظر پڑ گیا۔ جس کے آخر میں "کہ چہ" "یعنی چہ" کے معنی میں آیا تھا۔ وہ کتاب لے کر دوڑے ہوئے استاد کے پاس گئے۔ اور وہ شعر دکھایا۔ شیخ معظم اس کو دیکھ کر حیران رہ گئے۔ اور مرزا سے کہا کہ تم کو فارسی زبان سے خداداد مناسبت ہے۔ تم ضرور فکرِ شعر کیا کرو اور کسی کے اعتراض کی پروا نہ کرو۔ (یادگار غالب صفحہ ۹۰)

اتنی چھوٹی عمر میں شعر گوئی کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ نواب حسام الدین حیدر خاں نے ان کا کلام لے جاکر اپنے اُستاد میر تقی میر کو لکھنؤ میں دکھایا تھا۔ جس پر میر نے فرمایا "اگر اس لڑکے کو کوئی کامل اُستاد مل گیا تو یہ لاجواب شاعر بن جائے گا۔ (یادگار غالب صفحہ ۹۸)

ان واقعات اور ان شہادتوں سے مندرجہ ذیل چار امور واضح ہوجاتے ہیں:

۱۔ یہ کہ مرزا غالب نے خداداد استعداد کی وجہ سے واقعی دس گیارہ سال کی عمر میں شعر گوئی شروع کی اور ابتدا اُردو سے کی۔

۲۔ اسی عمر میں فارسی میں بھی شعر کہنے لگے۔

۳۔ اسی عمر میں اُن کا مطالعہ اتنا وسیع ہوچکا تھا کہ اپنے اشعار کے الفاظ و محاورات کی سند اساتذہ کے کلام سے پیش کرسکتے تھے۔ یعنی اساتذہ کا کلام اُن کی نظر سے گزر چکا تھا۔ یا وہ اس کا مطالعہ کرتے رہتے تھے۔

۴۔ وہ شاعری میں صنعتِ لفظی کی طرف بھی مائل تھے۔ پتنگ بازی کے زمانے کی نظم اس رجحان کی نشان دہی کرتی ہے۔

اس چھوٹی سی عمر میں شعر گوئی کی یہ صلاحیت اور مطالعہ کی یہ وسعت خداداد چیز ہے۔ اور بہت ہی کم کسی کو عطا ہوتی ہے۔ ڈاکٹر خورشید الاسلام غالب کے وسعت مطالعہ اور ذہنی

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۷۷) کے بعد ایک شعر ملا۔ ظہوری کی دونوں غزلوں کے مطلع اور مقطع یوں ہیں:

پہلی غزل: زکوئی بلدشہی گنجا بجای کہ چہ — بخیر بستہ جبیں سرانہ گدائی کہ چہ

مرا امید ظہوری کہ عقل ناقص ریخت — نیز نی در عشق گرہ کشائی کہ چہ

دوسری غزل: ہم تو کین درزد و کینہ دار کہ چہ — ہم تو غم خوار و غم گسار کہ چہ

شدہ ہجراں دگر ظہوری بس — زینہاراں بزینہار کہ چہ

حوالہ کے لئے دیکھئے دیوان ملّا نورالدین ظہوری۔ مطبع نول کشور۔ مطبوعہ ۱۸۹۷ء

ترقی کی رفتار کے متعلق یوں رقم طراز ہیں[۱]:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ ان کی ابتدائی علمی فتوحات میں سب سے اہم فارسی دانی ہے۔ انہوں نے اس زبان پر جو قدرت حاصل کی۔ اور فارسی ادب سے جو گہری واقفیت بہم پہنچائی وہ یقیناً حیرت انگیز ہے۔ یہ خاص طور ان حالات کے پیش نظر اور بھی حیرت انگیز ہو جاتی ہے۔ جن میں غالب کا لڑکپن گذرا۔ ہمیں یہ معلوم ہے کہ ان کی تعلیم و تربیت کا کوئی معقول انتظام نہیں کیا گیا تھا"

پھر آگے چل کر لکھتے ہیں:

"غالب کے بارے میں یوں تو ہم بہت کچھ جانتے ہیں۔ لیکن غالباً جو بظاہر معمولی لیکن اہم بات ہے اور جسے عام طور پر لوگ نظر انداز کر جاتے ہیں۔ وہ یہ ہے کہ غالب کی ذہنی رفتار ان کی عمر کے مقابلے میں ضرورت سے زیادہ تیز تھی۔ اگرچہ ان کی تعلیم باقاعدہ طور پر نہیں ہوئی تاہم ان کے مضامین شعری سے پتہ چلتا ہے۔ کہ ان کی نظر سے وہ سب کچھ گذر چکا ہوگا جو ان کے مشغلہ کے لئے ضروری تھا"

اس کا ثبوت خود غالب کے ایک خط سے بھی ملتا ہے جو علائی کے نام ہے۔ اس میں لکھتے ہیں:

"پچاس برس کی بات ہے۔ الٰہی بخش مرحوم نے ایک زمین نکالی، میں نے حسب الحکم غزل لکھی۔ بیت الغزل ہے

پلا دے اوک سے ساقی جو ہم سے نفرت ہے
پیالہ گر نہیں دیتا نہ دے شراب تو دے"

یہ خط ۱۸۶۲ء کا ہے۔ جس کے معنے یہ ہوئے کہ یہ غزل ۱۸۱۲ء میں لکھی گئی ہوگی۔ اور اُس وقت غالب کی عمر پندرہ سال یا اس سے بھی کم تھی۔ اس قسم کی ذہنی نشو و نما کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ کہ آدمی پردہ کے رنگ سے خوش یا مطمئن ہونے کی بجائے یہ جستجو کرنے لگتا ہے۔ کہ اس پردہ کے پیچھے کیا ہے۔ یعنی وہ کائنات کی پہیلی بوجھنے میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اور ایسی صورت میں اسے اپنے ذہنی وسائل پر ہی اکتفا کرنا پڑتا ہے۔ اور وہ اپنے وارداتِ قلب اور ذاتی تجربات کو زیادہ سے زیادہ موثر بنانے کے لئے صناعی پر زور دینے لگتا ہے۔ اور کائنات کی پہیلی کا حل الفاظ کی پہیلی میں پیش کرتا ہے۔

---

[۱] غالب۔ ابتدائی دور مصنفہ ڈاکٹر خورشید الاسلام۔ طبع اوّل۔

غالب نے شعر گوئی میں کافی جگر کاوی سے کام لیا ہے جب تک آگرہ میں رہے۔ اپنے ذوق سے لکھتے رہے۔ اس وقت تک زیادہ رجحان مشکل گوئی کی طرف تھا۔ اور صنایع بدایع یا رعایتِ لفظی مشکل گوئی کا ایک جزو ہیں۔ اسی وجہ سے ان کے ابتدائی کلام میں رعایتِ لفظی کی بہت سی مثالیں ملتی ہیں۔ دہلی میں مستقل طور پر اقامت گزیں ہونے کے بعد ان کے سخن گو اور سخن فہم دوستوں کا حلقہ بہت وسیع ہو گیا اور دہلی کے مباحثوں اور مشاعروں کی وجہ سے غالب کے کلام میں ایک اعتدال کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ مختلف وقتوں میں مختلف شاعروں کے کلام کے مطالعہ سے خود ہی اپنے اور اساتذہ کے کلام کا موازنہ کرتے رہے۔ اور آخر مشکل گوئی کے طلسمی حصار سے نکل کر میرؔ کی سی سادگی اور تاثیر کے قائل ہو گئے۔ مختلف اساتذہ کے اس اثر کو اپنے فارسی دیوان کے خاتمے میں یوں بیان کرتے ہیں:

"اگرچہ طبیعت ابتدا سے نادر اور برگزیدہ خیالات کی جویا تھی۔ لیکن آزادہ روی کے سبب زیادہ اُن لوگوں کی پیروی کرتا رہا۔ جو راہِ صواب سے نابلد تھے۔ آخر جب ان لوگوں نے جو اس راہ میں پیش رَو تھے۔ دیکھا۔ کہ میں باوجود یکہ ان کے ہمراہ چلنے کی قابلیت رکھتا ہوں۔ اور پھر بے راہ بھٹک رہا ہوں، اُن کو میرے حال پر رحم آیا اور انھوں نے مجھ پر مربیانہ نگاہ ڈالی۔ شیخ علی حزیں نے مسکرا کر میری بے راہ روی مجھ کو جتائی۔ طالب آملی اور عرفی شیرازی کی غضب آلود نگاہ نے آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا جو مادہ مجھ میں تھا۔ اُس کو فنا کر دیا۔ ظہوری نے اپنے کلام کی گیرائی سے میرے بازو پر تعویذ اور میری کمر پر زادِ راہ باندھا۔ اور نظیری نے اپنی خاص روش پر مجھ کو چلنا سکھایا۔" (ترجمہ فارسی سے اردو از مولانا عبدالسلام ندوی)[1]

غالب کے اس اعتراف سے ظاہر ہے کہ وہ عرصہ تک ان لوگوں کی روش پر چلتا رہا۔ جو راہِ صواب سے نابلد تھے۔ اور اُس میں آوارہ اور مطلق العنان پھرنے کا مادہ موجود تھا۔ جو آہستہ آہستہ فنا ہو گیا۔

"راہِ صواب سے نابلد"۔ "آوارہ"۔ "مطلق العنان پھرنے" سے اس کے سوا اور کوئی مطلب نہیں ہو سکتا کہ غالب کا ابتدائی میلان مشکل پسندی، مشکل گوئی اور لفظی صناعی کی طرف تھا۔

---

[1] شعر الہند جلد اوّل صفحہ ۲۵۱۔

لفظی صناعی میں ایسی دلکشی ہے کہ ہر شاعر خواہی نخواہی اس طرف مائل ہو جاتا ہے۔ صنایع بدایع کا عالمگیر دام اتنا وسیع ہے کہ تقریباً تمام اردو اور فارسی کے شعرا اس میں گرفتار ہیں۔ غالب جیسے ذہین اور اساتذہ کے کلام کے مطالعہ کے شوقین کا اس ہمرنگ زمین دام میں گرفتار ہو جانا کوئی بعید از عقل بات نہیں۔ خصوصاً ان حالات میں جبکہ اس کے پیش رو میر۔ سودا اور ناسخ اور اس کے ہم عصر شعرا کم و بیش اسی دام میں اسیر تھے۔ اور ظفر جو مرجع خلائق اور مربی شعرا تھے۔ اس صنعت گری کے دلدادہ تھے۔ غالب کے کلام میں حسنِ الفاظ اور حسنِ معانی کی طرف کئی واضح اشارے ہیں۔ اور مولانا ظہوری کی نثر (جو تصنع اور تکلف سے پُر ہے) اور نظم کی تقلید پر غالب نے فخر کا اظہار کیا ہے۔

۱۔ حُسنِ لفظ و معنیِ غالبؔ گواہ ناطق است
بر عیار کامل نقشِ من و آبائے من

۲۔ در تہ ہر حرف غالبؔ چیدہ ام میخانۂ
تا ز دیوانم کہ سرمستِ سخن خواہد شدن

۳۔ گنجینۂ معنی کا طلسم اس کو سمجھئے
جو لفظ کہ غالبؔ مری گفتار میں آوے

۴۔ نظم و نثر شورش انگیزی کہ میباید بخواہ
ایکہ می پُرسی کہ غالبؔ در سخن یکتاست ہست

۵۔ بہ نظم و نثر مولانا ظہوری زندہ ام غالبؔ
رگِ جاں کردہ ام شیرازہ اوراقِ کتابش را

غالب کا اردو دیوان نسبتاً بہت مختصر سا ہے۔ لیکن ہر لفظ صنایع بدایع معنوی کا طلسم ہے اور ہر حرف کی تہ میں رعایت لفظی کا میخانہ موجود ہے۔ جو غور کرنے والوں کو اس کے کلام کی شراب سے سرمست کرتا ہے۔

صنایع بدایع معنوی میں صنعتِ طباق ایک مشہور صنعت ہے۔ اسے صنعتِ مطابقت اور صنعتِ تضاد اور صنعتِ تکافو بھی کہتے ہیں۔ یادداشت کی سہولت کے لئے اسے صنعتِ تضاد کہنا

زیادہ مناسب ہے۔ اور تعریف اس کی یہ ہے کہ ایک ہی شعر میں دو لفظ ایسے لائے جاتے ہیں۔ جن کے معنی آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہوتے ہیں یا وہ ایک دوسرے کے مقابل ہوتے ہیں۔ لیکن یہ تقابل یا تضاد رکھنے والے الفاظ کلام میں اس طرح لائے جاتے ہیں کہ کلام کی روانی یا سلاست میں مخل نہ ہوں۔

طباق یا تضاد کی دو صورتیں ہوتی ہیں۔ کلام میں ایسے الفاظ لانا جو لغوی لحاظ سے ایک دوسرے کی ضد ہوں۔ مثلاً روز و شب، سود و زیاں، آمد و رفت، نیک و بد، سیاہ و سفید، آنا جانا۔ اٹھنا بیٹھنا۔ دوست دشمن۔ اقرار انکار وغیرہ، ایسے الفاظ کو کلام میں لانا طباق ایجابی کہلاتا ہے۔

طباق کی دوسری صورت یہ ہے کہ ایک مثبت لفظ کے ساتھ ن یا نہ علامتِ نفی بڑھا کر اسے منفی بنا لیا جاتا ہے اور یہ مثبت اور منفی الفاظ ایک دوسرے کی ضد ہو جاتے ہیں۔ مثلاً کرنا، نہ کرنا۔ جانا، نہ جانا، گفت، نگفت۔ ہوا، نہ ہوا۔ دیا، نہ دیا وغیرہ وغیرہ۔

غالب کے کلام میں یہ صنعت اتنی کثرت سے استعمال ہوئی ہے کہ شاعر کے قصد یا ارادے کا دخل صاف نظر آتا ہے۔ صرف اسی ایک صنعت کے کثرتِ استعمال سے بلا خوفِ تردید یہ کہا جا سکتا ہے کہ غالب صنایع بدایع کا دلدادہ تھا۔ چہ جائیکہ دوسری تمام صنایع و بدایع سے بھی اس کا اردو اور فارسی کلام پُر ہے۔

طباق ایجابی

۱۔ تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ	جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا
۲۔ بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا	آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا
۳۔ سادگی و پرکاری، بیخودی و ہشیاری	حُسن کو تغافل میں جرأت آزمایا پایا
۴۔ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا	نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا
۵۔ کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں	تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا
۶۔ فائدہ کیا سوچ آخر تو بھی دانا ہے اسدؔ	دوستی ناداں کی ہے جی کا زیاں ہو جائے گا

۷۔ درد منت کشِ دوا نہ ہوا — میں نہ اچھا ہوا برا نہ ہوا

۸۔ ہے آدمی بجائے خود اک محشرِ خیال — ہم انجمن سمجھتے ہیں خلوت ہی کیوں نہ ہو

۹۔ نہ کہہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے — مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

۱۰۔ یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا — عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

۱۱۔ دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسدؔ — غلطی کی کہ جو کافر کو مسلماں سمجھا

۱۲۔ بروئے شش جہت درِ آئینہ باز ہے — یاں امتیازِ ناقص و کامل نہیں رہا

۱۳۔ ہے غیبِ غیب جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود — ہیں خواب میں ہنوز جو جاگے ہیں خواب میں

۱۴۔ پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے — رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

۱۵۔ نہ ہو بہ ہرزہ بیاباں نوردِ وہمِ وجود — ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

۱۶۔ وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

۱۷۔ غرۂ اوجِ بنائے عالمِ امکاں نہ پوچھ — اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

۱۸۔ جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں — جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیرباد نہیں

۱۹۔ ہے سبزہ زار ہر در و دیوارِ غم کدہ — جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

۲۰۔ کر دیا ضعف نے عاجز غالب — ننگِ پیری ہے جوانی میری

۲۱۔ ہے وصل ہجر عالمِ تمکین و ضبط میں — معشوقِ شوخ و عاشقِ دیوانہ چاہیے

۲۲۔ محبت میں نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا — اسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

۲۳۔ حرفِ اعدا اثرِ شعلۂ دودِ دوزخ — وقفِ احبابِ گل و سنبلِ فردوس بریں

۲۴۔ ایک میں کیا سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور ترا انجام

۲۵۔ میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام

۲۶ اس قدح کا ہے دَور مجھ کو نقد — چرخ نے لی ہے جس سے گردشِ دام

۲۷۔ بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار — دل کے لینے میں جن کو ہے ابرام

۲۸۔ ہماری سادگی تھی التفاتِ ناز پر مرنا — ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

۲۹۔ کہوں کیا خوبیِ اوضاعِ ابنائے زماں غالب — بدی کی اس نے جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی

۳۰۔ بے اعتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

۳۱۔ تھی نوآموز فنا ہمتِ دشوار پسند — سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا

۳۲۔ طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ — دوزخ میں ڈال دو کوئی لے کر بہشت کو

۳۳۔ لیتا نہ اگر دل تمہیں دیتا کوئی دم چین — کرتا جو نہ مرتا کوئی دن آہ و فغاں اور

۳۴۔ جسے نصیب ہو روزِ سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

۳۵۔ کی اس نے گرم سینۂ اہلِ ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

۳۶۔ کیوں مری غمخوارگی کا تجھ کو آیا تھا خیال — دشمنی اپنی تھی میری دوستداری ہائے ہائے

۳۷۔ میرے ہونے میں کیا ہے رسوائی — اے وہ مجلس نہیں خلوت ہی سہی

۳۸۔ اپنی ہستی سے ہی ہو جو کچھ ہو — آگہی گر نہیں غفلت ہی سہی

۳۹۔ میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں — مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ہے

۴۰۔ گذرا اسد مسرتِ پیغامِ یار سے — قاصد پہ مجھ کو رشکِ سوال و جواب ہے

۴۱۔ گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق — پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

۴۲۔ نسیہ و نقدِ دو عالم کی حقیقت معلوم — لے لیا مجھ سے مری ہمتِ عالی نے مجھے

۴۳۔ کثرت آرائی وحدت ہے پرستاری وہم — کر دیا کافر ان اصنامِ خیالی نے مجھے

۴۴۔ غنچہ تا شگفتن ہا برگِ عافیت معلوم — باوجودِ دل جمعی خوابِ گل پریشاں ہے

۴۵۔ دلِ ناداں تجھے ہوا کیا ہے؟ — آخر اس درد کی دوا کیا ہے؟

۴۶۔ عشق سے طبیعت نے زیست کا مزا پایا — درد کی دوا پائی دردِ لا دوا پایا

۴۷۔ ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے؟

۴۸۔ ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

۴۹۔ خوب تھا پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ — کہ بھلا چاہتے ہو اور برا ہوتا ہے

۵۰۔ یہ باعثِ نومیدی اربابِ ہوس ہے — غالب کو برا کہتے ہو اچھا نہیں کرتے

۵۱۔ ہم پیشہ و ہم مشرب و ہم راز ہے میرا — غالب کو برا کیوں کہو اچھا مرے آگے

۵۲۔ پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہلِ شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

۵۳۔ دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ — نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

۵۴۔ غالب برا نہ مان جو واعظ برا کہے — ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچھا کہیں جسے

۵۵۔ غم کھانے میں بودا دلِ ناکام بہت ہے — یہ رنج کہ کم ہے مے گلفام بہت ہے

۵۶۔ ہیں اہلِ خرد کس روشِ خاص پہ نازاں — پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

۵۷۔ ہے قہر گر اب بھی نہ بنے بات کہ ان کو — انکار نہیں اور مجھے ابرام بہت ہے

۵۸۔ جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیٔ الہام

۵۹۔ جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہ ہائے لیالی و ایام

۶۰۔ ہے ازل سے روائیٔ آغاز — ہو ابد تک رسائی انجام

۶۱۔ زمانہ سخت کم آزار ہے بجان اسد — وگرنہ ہم تو توقع زیادہ رکھتے ہیں

۶۲۔ تم کرو صاحبقرانی جب تلک — ہے طلسم روز و شب کا در کھلا

۶۳۔ اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور — جب تلک ہے وجودِ سایہ و نور

۶۴۔ میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

۶۵۔ غالب یہ کیا بیاں ہے بجز مدحِ بادشہ — بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت و خواند

۶۶۔ دریائے معاصی تنک آبی سے ہوا خشک — میرا سرِ دامن بھی ابھی تر نہ ہوا تھا

۶۷۔ تمنائے زباں محوِ سپاسِ بے زبانی ہے — مٹا جس سے تقاضا شکوۂ بے دست و پائی کا

۶۸۔ گھر ہمارا جو نہ روتے بھی تو ویراں ہوتا — بحر گر بحر نہ ہوتا تو بیاباں ہوتا

۶۹۔ جو منکرِ وفا ہو فریب اس پہ کیا چلے — کیوں بدگماں ہوں دوست سے دشمن کے باب میں

۷۰۔ وعدۂ سیرِ گلستاں ہے خوشا طالعِ شوق — وعدۂ قتل مقدر ہے جو مذکور نہیں

۷۱۔ ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالب — میرے دعوے پہ یہ حجت ہے کہ مشہور نہیں

۷۲۔ سب کہاں کچھ لالہ و گل میں نمایاں ہو گئیں — خاک میں کیا صورتیں ہوں گی کہ پنہاں ہو گئیں

۷۳۔ واں گیا بھی میں تو ان کی گالیوں کا کیا جواب — یاد تھیں جتنی دعائیں صرفِ درباں ہو گئیں

۷۴۔ بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی — شبِ مہ ہو جو رکھ دیں پنبہ دیواروں کے روزن میں

۷۵۔ وفاداری بشرطِ استواری اصل ایماں ہے — مرے بت خانے میں تو کعبے میں گاڑو برہمن کو

۷۶۔ نکالا چاہتا ہے کام کیا طعنوں سے تو غالبؔ　　ترے بے مہر کہنے سے وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو

۷۷۔ پنہاں پرنیاں میں شعلۂ آتش کا آساں ہے　　ولے مشکل ہے حکمت دل میں سوزِ غم چھپانے کی

۷۸۔ خزاں کیا، فصلِ گل کہتے ہیں کس کو کوئی موسم ہو　　وہی ہم ہیں قفس ہے اور ماتم بال و پر کا ہے

۷۹۔ زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال　　راہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

۸۰۔ اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی　　سایہ کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے

۸۱۔ بے دلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق　　بے کسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

۸۲۔ تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید　　تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

فارسی کلام سے طباق ایجابی کی مثالیں ۔ فارسی کلام میں سے میں نے مثنویوں اور قصاید سے بخوفِ طوالت مثالیں نہیں دیں۔ یہ مثالیں زیادہ تر غزلیات اور قطعات میں سے ہیں۔

۸۳۔ ای بخلا و ملا ذات تو ہنگامہ زا　　باہمہ در گفتگو بے ہمہ با ماجرا

۸۴۔ گر نمک سود کنی زخمِ دلم　　سود زخمست و زیان نمک است

۸۵۔ رسم پیماں بمیاں آمدہ خود را نازم　　گفتہ باشد کہ بستن چہ کشاید چہ عجب

۸۶۔ نازم بخشش را و نیابم و ہنش را　　خوش تفرقہ در باطل و حق میکنیم امشب

۸۷ یار در عہد شبابم بکنار آمد و رفت　　ہمچو عیدی کہ در ایام بہار آمد و رفت

۸۸۔ کاے عجب افتادہ بدیں شیفتہ مارا　　مومن نبود غالبؔ و کافر نتواں گفت

۸۹۔ کم خود گیر و بیش شو غالبؔ　　قطرہ از ترک خویشتن گہر است

۹۰۔ مقطع ایں قطعہ زیں مصرع مصرع یاد و بس　　ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

۹۱۔ دانم کہ امر و نہی بود در کلامِ حق　　سیرابی نیست از آں آبجو را

۹۲۔ چراست ایں کہ نداری زراز سپید و سیاہ　　چراست ایں کہ نیابی بر از کثیر و قلیل

۹۳۔ دارم شگرف حالی از مرگ و زیست بیروں　　چاں گر چہ ہست شیریں تلخ است زندگانی

۹۴۔ چوں عطای تو بود پاک ز تحریم چہ باک　　می حرام است ولی میخورم و ندچہ حلال

۹۵۔ شہزادہ خورد سال و بود پیر روزگار　　شوخی بشاہزادہ چہا کرد روزگار

۹۶۔ عالمی راست در نہان و عیاں　　دل غم اندوز و دیدہ دریا بار

٩٧۔ درد این سو فشرده پا در دل — اشک آن سو دویده بر رخسار

٩٨۔ ناز پروردهٔ نیازی هست — عجز من در گذارش اعجاز

٩٩۔ باز بر آنم که نیاز آورم — رخ بتماشاگه ناز آورم

١٠٠۔ چو مژده دوست نوازم چو فتنه خصم گداز — بدل ز سادگی و بازبان ز پرکاری

١٠١۔ ز من بجرم تپیدن کناره می کردی — بیا بخاک من و آرمیدنم بنگر

١٠٢۔ از گریهٔ من تا چه سر ایند ظریفان — زین خنده که دارم بتمنائی اثر بر

١٠٣۔ از خلد و سقر تا چه دهد دوست که دارم — عیشی بخیال اندر و داغی بجگر بر

١٠٤۔ یقین عشق کن و از سر گمان برخیز — بآشتی بنشین یا بامتحان برخیز

١٠٥۔ اے که در رو لا زاری بیش را کم انگاری — در شمار غم خواری بیشی کم از من پرس

١٠٦۔ تم فرسود در بند تو بسیار — دلت بخشود بر کار من اندک

١٠٧۔ سر کو چک دلی های تو گردم — که آسان کرده دشوار من اندک

١٠٨۔ در روزهائے فرخ و شبهائے دل فروز — صهبا بروز ابر و شب ماهتاب خواه

١٠٩۔ محو گشتم در تغافل بر نتابم التفات — گر بچشم جا دہی خواب گران خواهم شدن

١١٠۔ در خلد ز شادی چه رود بر سرم آیا — چون کم نشود باده ز بسیار کشیدن

١١١۔ خوش بود فارغ ز بند کفر و ایمان زیستن — حیف کافر مردن و آوخ مسلمان زیستن

١١٢۔ شیوهٔ رندان بے پروا خرام از من مپرس — این قدر دانم که دشوار است آسان زیستن

١١٣۔ رقیب از کوچه گردی آبرو یافت — بکوی دوست دشمن رهبرش بین

١١٤۔ برگشته ام ز دهر و نمی گیریم به قهر — دارم دو صد جواب و لی یک سوال کو

١١٥۔ دانش و گنجینه پنداری یکیست — حق نهان داد آنچه پیدا خواستیم

١١٦۔ خود این نامه فهرست راز حق است — درون و برونش طراز حق است

١١٧۔ خار افگنی در رهِ من تم سان ز برق آهِ من — طفلانِ نادان یکطرف پیرانِ دانا یکطرف

١١٨۔ با دیده و دل از دو سو ماندم به بند غم فرد — اندوه پنهان یکطرف آشوب پیدا یکطرف

١١٩۔ شدم سپاس گذار خود از شکایت شوق — زهے ز من بدلِ بی غش سرایت شوق

۱۲۰۔ بخود مناز و بہ آموزگارِ ہم بپذیر	من و نہایت عشق و ز تو ہدایت شوق
۱۲۱۔ راحت خود جستم و رنج فراواں یافتم	مژدہ دشمن را اگر جہدے در آزارش کنم
۱۲۲۔ لذت زخم چو خوں غالب در اعضائی دود	رنج اگر اینست راحت اعضاں خواہم شدن
۱۲۳۔ حسنِ لفظ و معنیٔ غالب گواہ ناطق است	بر عیار کامل نفس من و آبائے من
۱۲۴۔ دیدہ گر روشن سواد ظلمت و نور است چیست	فارغ از اہرمن و غافل ز یزداں زیستن
۱۲۵۔ غالب از ہندوستاں بگریز فرصت مفت نیست	در نجف مردن خوشست و صفاہاں زیستن

طباق سلبی

۱۲۶۔ ہاں کھائیو مت فریبِ ہستی	ہر چند کہیں کہ ہے نہیں ہے
۱۲۷۔ پیچ آ پڑی ہے وعدۂ دلدار کی مجھے	وہ آئے یا نہ آئے مجھے انتظار ہے
۱۲۸۔ دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے	ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
۱۲۹۔ دل میں پھر گریہ نے اک شور اٹھایا غالب	آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفاں نکلا
۱۳۰۔ غم اگرچہ جاں گسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے	غمِ عشق گر نہ ہوتا غمِ روزگار ہوتا
۱۳۱۔ رات کے وقت مے پیئے ساتھ رقیب کو لیے	آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں
۱۳۲۔ ادب ہے اور یہی کشمکش تو کیا کیجے	حیا ہے اور یہی گومگو تو کیونکر ہو
۱۳۳۔ آپ سے وہ مرا احوال نہ پوچھے تو اسدؔ	حسبِ حال اپنے پھر اشعار کہوں یا نہ کہوں
۱۳۴۔ خم خم شراب عربدہ داری دگر چہ ہست	خاطر شکستن و نشکستن خمارِ من
۱۳۵۔ خاطر منت پذیر و خوئے نازک دادہ	گر بہ بخشی شرمسارم ور نہ بخشی وائے من
۱۳۶۔ گذشت از دل و لے نگذشت از دل	خدنگ غمزۂ زوریں کماناں
۱۳۷۔ گمان زیست بود بر منت ز بیدردی	بد است مرگ و لے بدتر از گمانِ تو نیست
۱۳۸۔ ہم وفا ہم خواہشِ ما ہیچ پرسش عیب نیست	آنکہ می گفتی کہ خواہش را وفا بیجاست ہست
۱۳۹۔ زغنا لذتِ بیداد کزیں راہگذر	بکساں می رسد آنکس کہ بخود ہم نرسد
۱۴۰۔ عجب بود سر بیخوابی کسی غالبؔ	مرا کہ بالش و بستر ز پرنیاں نبود

ان ایک سو چالیس مثالوں میں سے سو کے قریب مثالیں اُردو کے مختصر سے دیوان سے لی گئی ہیں۔ لیکن یہ خیال نہیں کرنا چاہئے کہ اب اردو یا فارسی کے دیوان میں اور کوئی مثال باقی نہیں رہی۔ فارسی کا دیوان اس صنعت سے اس قدر مالا مال ہے کہ سینکڑوں اور مثالیں صرف فارسی اشعار سے ہی دی جا سکتی ہیں۔ اردو اشعار میں بھی ابھی اور مثالیں موجود ہیں۔ جن کو ہم نے دیدہ دانستہ چھوڑ دیا ہے۔ مثلاً

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل　　سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آسان کہنے کی کرتے ہیں فرمائش　　گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

اس میں صنعت طباق ایجابی بھی ہے اور صنعت طباق سلبی بھی۔ آسان اور مشکل میں طباق یا تضاد ایجابی ہے اور گویم اور نگویم میں طباق سلبی۔ اس کے علاوہ بھی اس شعر میں ایک صنعت ہے۔ اور وہ صنعت تجنیس قلب ہے۔ کلام اور کامل مقلوب بعض ہیں۔ ہم نے اس شعر کو صنعتِ طباق میں نہیں صنعتِ تجنیس کے ضمن میں درج کیا ہے۔

صنعتِ طباق یا تضاد کی اس قدر زیادہ مثالیں ہیں۔ کہ ہم یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ کہ غالب نے ارادۃً اپنے کلام میں یہ صنعت اور دوسرے صنایع بدایع پیدا کئے ہیں۔ ہم نے پچاس سے زیادہ صنایع بدایع کی اقسام جمع کی ہیں۔ اور ہر قسم کے صنایع بدایع کی اتنی مثالیں دی ہیں کہ ان میں شاعر کے قصد اور ارادے کے دخل کا یقین ہو جائے۔

غالب کے تمام تنقید نگار غالب کی اس صناعی کو شاید اس کے رتبہ سے فروتر سمجھتے ہوئے اس کا ذکر دبی زبان سے کرتے ہیں۔ عبدالسلام ندوی ایک دو لفظوں میں اس صناعی کا ذکر یوں کرتے ہیں:

"حسنِ معنی کے ساتھ غالب کا کلام حسنِ الفاظ۔ حسنِ بندش اور حُسنِ ترکیب کا بھی ایک بہترین نمونہ ہے۔" [۱]

رام بابو سکسینہ اور ان کی کتاب تاریخ ادب اردو کے مترجم مرزا محمد عسکری بھی صنایع بدایع کا ذکر نہیں کرتے۔ اور غالب کے کلام پر اظہارِ رائے یوں کرتے ہیں۔

---

[۱] شعر الہند حصہ اوّل مطبوعہ مطبع معارف اعظم گڑھ۔ صفحہ ۲۶۳

"ابتدائی کلام کی خصوصیات حسب ذیل ہیں: عجیب و غریب تشبیہیں۔ ایسی بلند پروازیاں جن سے شعر کے معنی مبہم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فارسی کی ایسی بندشیں اور ایسے غیر مانوس الفاظ جو شعر کی روانی اور فصاحتِ کلام کے منافی ہیں[1]۔"

ڈاکٹر عبدالرحمٰن بجنوری نے اپنے بلند پایہ اور گرانمایہ "دیباچہ دیوان غالب" غالب کے صنایع بدایع کا ذکر بھی کیا ہے۔ اور ایک خاص صنعت کی چھ مثالیں بھی دی ہیں:

"قابلِ عزت ہیں وہ تمام فضلاء جنھوں نے علم صنایع بدایع کو فروغ دیا۔ لیکن اگر ان کی تمام کتابیں جلا دی جائیں تو شعراء کا ذرا بھی نقصان نہیں ہوتا[2]۔"

"صنائع بدائع کے استعمال سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ طبیعت میں آمد نہیں ہے۔ اور صنایع بدایع کا استعمال کلام کو عام ادبی زندگی سے جدا کر دیتا ہے۔ اور جس زمانہ میں صنایع بدایع کا رواج عام ہو وہ زمانہ اقوام کے انحطاط اور زوال کا ہوتا ہے۔ غالب بہت کم صنایع بدایع استعمال کرتے ہیں۔"
(دیباچہ دیوان غالب نسخۂ حمیدیہ صفحہ ۴۹)

ہمیں بجنوری مرحوم کے علم و فضل کا پورا احترام ہے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ مرحوم نے کلامِ غالب میں صنایع بدایع تلاش کرنے کی زحمت ہی گوارا نہیں کی۔ ورنہ غالب کے ہر پانچویں شعر میں کوئی نہ کوئی صنعت اُنھیں نظر آجاتی۔

پھر اسی دیباچہ میں فرماتے ہیں: "لیکن ایک خصوصیت ان کے کلام میں ایسی ہے۔ جس کی مثال کسی دوسرے شاعر کے کلام میں نہیں۔ جس طرح سفید رنگ میں تمام آفتابی الوان مضمر ہیں۔ ان کے بعض اشعار کی سادگی میں عجیب و غریب لطیف معنی پنہاں ہیں۔ جیسے کولمبس نے امریکہ کو دریافت کیا تھا۔ مولانا حالی نے اس نئی دنیا کا پتہ لگایا ہے اور حقیقت میں مولانا حالی مرزا غالب سے کچھ کم مستحق داد نہیں۔"

---

[1] تاریخ ادبِ اُردو۔ طبع سوم۔ صفحہ ۲۳۲۔

[2] اور اگر شعراء کے کلام سے صنایع بدایع نکال دی جائیں تو بعض شعراء کے پاس فی الحقیقت کچھ نہ رہے۔ مؤلف۔

اس کے بعد غالب کے کلام سے ان چھ اشعار کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ یہ اشعار ذو معنیین ہیں :

۱۔ کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

۲۔ کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرّر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

۳۔ کیونکر اس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

۴۔ ترے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنہ کو کم دیکھتے ہیں

۵۔ سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرّر چاہا
ہنس کے بولے کے ترے سر کی قسم ہے ہم کو

۶۔ اُلجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ،
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہوں

کسی شعر میں دو معنی پیدا کرنا بھی صنعت ہے۔ اگر وہ دونوں ایک دوسرے کے متضاد ہوں تو اُسے صنعت محتمل الضدین کہتے ہیں۔ اور اگر ان دونوں معنوں میں تضاد نہ ہو تو اُسے صنعتِ ادماج کہتے ہیں۔ اگرچہ بجنوری مرحوم نے واضح طور پر ان اشعار کی صنعت کا نام نہیں لیا۔ تاہم ان اشعار میں انہیں ایک علیحدہ خصوصیت ضرور نظر آئی ہے۔ ہم نے یہ اور دو اور اشعار صنعتِ ادماج کی مثالوں میں پیش کئے ہیں۔

اسی طرح مولانا حالی نے مقدمہ شعر و شاعری میں تخیّل یا امیجنیشن کی تعریف کرنے کے اُس کی وضاحت کے لئے غالب کا یہ شعر لکھا ہے :

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

اس شعر کی بھی چوڑی تشریح کرتے ہوئے حالی کی قلم سے یہ بات نہیں نکلتی کہ اس شعر میں صنعت حسن التعلیل ہے اور حسن التعلیل یہ ہے کہ شاعر ایک چیز یا واقعہ یا حقیقت کے متعلق ایک ایسی علت بیان کرتا ہے ۔ جو دراصل اس کی علت نہیں ہوتی ۔ یوں سمجھئے ۔ کہ کسی چیز کی شاعرانہ توجیہہ کرنا حسن التعلیل ہے ۔

مولانا نیاز فتحپوری نے نگار کا غالب نمبر شائع کیا ۔ جو "مشکلات غالب" کے نام سے غالب کے بعض اشعار کی شرح لکھی ۔ انہوں نے واضح طور پہ صرف یہی بار بار کہا ہے ۔ کہ غالب کے اکثر اشعار میں رعایت لفظی سے کام لیا گیا ہے ۔ صنایع بدایع کی نشان دہی نہیں کی ۔

کلام غالب کے اکثر شارحین نے اپنے اپنے ذوق اور استعداد کے لحاظ سے کافی دقت نظر سے کام لیا ہے ۔ بعض نے لفظی اور معنوی تحقیق کو سامنے رکھا ہے ۔ بعض نے اس عقیدے کو پیش نظر رکھا ہے ۔ کہ غالب کے کلام میں کسی خامی کا پایا جانا ناممکن ہے ۔ اس لئے انہوں نے بعض اشعار کو کھینچ تان کر کوئی نہ کوئی اعلیٰ مفہوم اُن سے منسوب کیا ہے ۔ اور بعض نے ہر شعر کو فلسفہ ، حکمت اور تصوف کا طلسم سمجھا ہے ۔ لیکن اس امر کی طرف کسی نے توجہ نہیں دی کہ غالب نے قدیم روایات کی تقلید کرتے ہوئے اپنے اکثر اشعار کو صنایع بدایع لفظی و معنوی سے بھی مزین کیا ہے ۔ اور اس عظیم شاعر کے کلام میں جہاں اور محاسن ہیں ۔ محاسن الفاظ بھی ہیں ۔ اور اکثر الفاظ کے پس پردہ صنایع بدایع کے بتانِ طناز پردہ نشین ہیں ۔

مبالغہ بھی ایک معنوی صنعت ہے ۔ اور اس کی تین قسمیں تبلیغ ، اغراق اور غلو ہیں ۔ تبلیغ تو یہ ہے کہ ع بڑھا بھی دیتے ہیں کچھ زیب داستاں کے لئے ۔ اغراق ایسا مبالغہ ہے ، کہ عقل اُسے تسلیم کرے خواہ عادتاً وہ وقوع پذیر نہ ہو ۔ یا عادتاً وقوع پذیر ہوتا ہو گو عقل اُسے ماننے میں تامل کرے ۔ اور غلو ایسا مبالغہ ہے کہ عقل و عادت دونوں کے نزدیک ناممکن ہو ۔ غالب دعویٰ کرتے ہیں :

ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غُلو کے قائل

دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم

یا خدا غالبِ عاصی کے خداوند کو دے

دو وہ چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم

اولاً عمرِ طبیعی بہ دوامِ اقبال
ثانیاً دولتِ دیدار شہنشاہِ اُمم

اور اس دعا میں واقعی وہ اغراق سے کام لیتے ہیں۔ اور اغراق شاعری میں ہر لحاظ سے جائز سمجھا جاتا ہے۔ لیکن غلو اور وہ بھی مدح میں صرف انہی شعرا کا شعار تھا جو شاہی درباروں میں شیئاً لِلّٰہ کی صدا لگانے والے تھے۔ حیران ہوں کہ غالب جیسا خوددار اور بلند طبع شخص ابوظفر بہادر شاہ اور انگریز افسروں اور حاکموں کی مدح میں غلو کے درجے تک کیوں پہنچ جاتا ہے۔ کیا احتیاج واقعی شیروں کو روبہ مزاج بنا دیتی ہے یا اس معاملہ میں غالب نے فارسی قصیدہ گو شاعروں کی تقلید کی ہے:

کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا — ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

زور بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و رستم و رہام

مہر کانپا۔ چرخ چکر کھا گیا — بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا — ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

نصیرِ دولت و دیں اور معینِ ملت و ملک — بنا ہے چرخِ بریں جس کے آستاں کے لئے

دُم ضیغم زدہ در کلبۂ روبہ جاروب — چشمِ شاہیں شدہ در پائے کبوتر خلخال

لامکاں گر نتواں گفت تواں گفت کہ شاہ — برتر از ہر چہ تواں گفت مکانے دارد

صنعتِ حسن التعلیل کا ہم اوپر ذکر کر آئے ہیں۔ کسی امر کی اصلی وجہ کچھ اور ہوتی ہے۔ لیکن شاعر اس کے لئے اپنے زورِ تخیل سے جو وجہ بیان کرتا ہے، وہ اصلی وجہ سے کہیں زیادہ دلکش ہوتی ہے۔ یہی وہ صنعت ہے جس میں شاعر کے تخیل کی بلندی ذہن کی رسائی کا اظہار ہوتا ہے۔ غالب نے اس صنعت میں وہ کمال دکھایا ہے، کہ باید و شاید۔ اکثر عالموں نے حسن تعلیل کے لئے غالب کا یہ شعر پیش کیا ہے۔

ے اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا
جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

مگر میرے سامنے غالب کے کئی ایسے اشعار ہیں۔ جن میں یہ صنعت بڑی عمدگی اور لطافت کے ساتھ موجود ہے۔ دو تین مثالیں دیکھئے:

۱۔ خداوند تعالیٰ نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو، سب نے سجدہ کیا، سوائے ابلیس کے۔ ابلیس نے انکار کیا اور تکبّر کیا اور وہ کافروں میں سے ہو گیا۔[1] ابلیس نے آدم کو کیوں سجدہ نہ کیا۔ مفسّرین کہتے ہیں تکبّر کی وجہ۔ فلسفیانہ موشگاف کچھ اور کہتے ہیں۔ صوفی کچھ اور تشریح کرتے ہیں۔ علماء کچھ اور کہتے ہیں اور فقہاء کچھ اور۔ مگر ہمارا ظریف شاعر اس انکار کی یوں توجیہ کرتا ہے:

ے ہمچو تو ناقابلی در صلب آدم دیدہ بود
زاں سبب ابلیس ملعوں سجدہ بر آدم نکرد

اپنے ایک نالائق اور کم ظرف حریف کی طرف اشارہ کر کے کہتے ہیں کہ ابلیس نے دیکھ لیا تھا کہ تیرا جیسا نااہل بھی اس آدم کی اولاد میں سے ہو گا۔ اور جس شخص کی اولاد میں سے تیرے جیسا ننگِ آدم پیدا ہونا تھا۔ اسے سجدہ کیا کرنا۔ اس لئے ابلیس نے آدم کو سجدہ نہ کیا۔ اس سے زیادہ دلکش اور دلپذیر علت کسی نے بیان نہیں کی۔

۲۔ خداوند تعالیٰ بزرگ ہے برتر ہے۔ خبیر ہے، بصیر ہے، سمیع ہے، علیم ہے، دانا ہے، توانا ہے۔ یہ توانائی اور طاقت خدا کو کیوں حاصل ہے۔ اس پر تو غور کرنا ہی گناہ کے مترادف ہے۔ ہمارا سب کا ایمان ہے کہ ازل سے خداوند تعالیٰ انہی صفات سے متصف ہے، اور ابد تک انہی صفات سے متصف رہے گا۔ غالب نے خداوند تعالیٰ کی توانائی کے لئے جو وجہ بتائی ہے۔ اُسے سُنئے اور لُطف لیجئے:

---

[1] وَاِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰى وَاسْتَكْبَرَ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ○ (قرآن مجید ۳۴/۲)

آں مرد کہ زن گرفت دانا نبود
از غصۂ فراغتش ہمانا نبود
دارد بجہاں خانہ وزن نیست درو
نازم بہ خدا چرا توانا نبود

۲ - شراب حرام ہے - اس کی حرمت کسی دلیل یا سند کی محتاج نہیں - ہر مسلمان جانتا ہے کہ شراب حرام ہے، شاعروں نے شراب کے جواز کے کئی وجوہ پیدا کئے ہیں - نظیری کہتا ہے:

بے کیمیائی مستی تحلیلِ غم محال است
یا مے حلال فرما یا غم حرام گرداں

خیام کہتا ہے:

گویند کہ فردوس بریں خواہد بود
وانجا مئے ناب و حورعیں خواہد بود
گر ما مئے و محبوب گزینیم چہ باک
چوں عاقبت کار چنیں خواہد بود

غالب کا استدلال کچھ کچھ عمر خیام کے استدلال سے ملتا ہے، مگر اظہار و ابلاغ کا انداز اچھوتا ہے - اپنے ممدوح سے کہتا ہے - کہ تیری بزم بہشت ہے اور بہشت میں شراب حلال ہے - تو بے حساب شراب پی اور پلا - اور اگر کہیں بازپرس ہوئی تو میں جواب دوں گا:

شاہا بہ بزم جشن چوں شاہاں شراب خواہ
زر بے حساب بخش و قدح بے حساب خواہ
بزمست بہشت و بادہ حلال است در بہشت
گر بازپرس رُو دہد، از من جواب خواہ

ہم نے آغاز کتاب میں ذکر کیا تھا کہ رودکی کے ایک شعر میں سات اور ناسخ کے ایک شعر میں تین صنایع بدائع پائے جاتے ہیں۔ اب اس دیباچہ کے اختتام پر ہم غالب کے چند ایسے اشعار پیش کرتے ہیں کہ جن میں دو دو یا تین تین یا چار چار صنایع بدائع موجود ہیں۔ یہ مثالیں ہمارے اس دعویٰ پر حجت ہیں، کہ صنایع بدایع کی جو رسم رودکی سے شروع ہو کر یکے بعد دیگرے بیدل اور ظہوری تک اور پھر اردو شاعری میں ولی سے لے کر غالب تک پہنچی، غالب اس روایت کی پابندی میں اور اساتذہ سلف کے نقش قدم پر چلنے میں کسی سے پیچھے نہیں رہا۔ بلکہ اس نے اس رسم کو اپنی صناعی کے کمال سے اور جلا بخشی ہے:

۱۔ آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضع سوز و نم و رم و آرام

اس شعر میں صنایع بدایع کی تین قسمیں ہیں۔ اوّل مراعات النظیر یعنی اربعہ عناصر کا کلام میں ایک جگہ لانا۔ دوم صنعت جمع و تفریق آتش و آب و باد و خاک کو ایک جگہ جمع کر کے پھر ان کی وضع میں فرق ظاہر کیا گیا۔ اور سوم صنعت لف و نشر مرتب ہے۔ چار چیزوں کا ذکر کر کے پھر اسی ترتیب سے ان کے مناسبات بیان کئے گئے ہیں:

۲۔ کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

اس شعر میں چار صنایع بدایع ہیں۔ اوّل تجاہل عارفانہ، دوم صنعت جمع۔ سوم مراعات النظیر اور چہارم مہ اور مہر میں تجنیس زاید و ناقص۔

۳۔ حرف اعدا، اثر شعلۂ دُودِ دوزخ
وقف احباب، گل و سنبل فردوس بریں

اس شعر میں صنعت تضاد، صنعت مقابلہ، صنعت مراعات النظیر اور صنعت ترصیع چار صنایع بدایع ہیں۔

۴۔ کہاں ہے ساقی مہوش، کہاں ہے ابر مطیر
بیار، لا، مے گلنار گوں، بیار، برس

اس شعر میں تجنیس مضارع، تجنیس خطی اور صنعت مراعات النظیر اور صنعت ترجمۃ اللفظ (بیار، لا

بہار، برس) ہے۔

۵۔ جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز

جس کا ہر قول معنئ الہام

اس شعر میں صنعتِ تضاد، مراعات النظیر، اور ترصیع ہے۔

۶۔ مقطع ایں قطعہ زیں مصرع مصرّع باد وبس

ہر چہ در گفتار فخرِ تست آں ننگِ من است

اس شعر میں صنعتِ تضاد (فخر و ننگ) صنعتِ اشتقاق (مقطع و قطعہ) صنعت تجنیس محرّف (مصرع، مصرّع)

اور صنعتِ تفریق ہے۔

۷۔ چوں عطای تو بود پاک ز تحریم چہ باک

می حرام است ولی میخورم از وجہ حلال

اس شعر میں صنعتِ تضاد (حرام و حلال) صنعتِ تجنیس محرّف (مَی اور می) صنعت تجنیس خطی (پاک اور باک)

اور صنعتِ حسن التعلیل، پانچ صنایع بدایع ہیں۔

۸۔ درد ایں سو فشردہ پا در دل

اشک آنسو دویدہ بر رخسار

اس شعر میں صنعتِ تضاد (پا فشردن اور دویدن) صنعتِ ایہام (آنسو) اور صنعت ترجمۃ اللفظ (اشک آنسو) ہے۔

آخر میں مَیں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ غالب کا کلام جہاں معنوی لحاظ سے اس قدر بلند ہے کہ ہر ادیب، شاعر،

نقّاد اور شارح اس کی تعریف میں رطب اللسان ہے۔ وہاں صوری محاسن اور لفظی صنایع بدایع سے بھی مالامال ہے۔

۹۔ آنکہ می گویند آں بہتر ز حُسن

یار ما ایں دارد و آں نیز ہم

لیکن عرصہ سے غالب کے محاسن الفاظ کی طرف کسی نے پوری توجہ مبذول نہیں کی۔ بجنوری مرحوم

کے قول کے مطابق اِس امریکہ کو دریافت کرنے والا اگر حالی ہے۔ تو مَیں اِس امریکہ کا پہلا آبادکار

ہوں۔ اور میرے لئے یہی فخر بہت کافی ہے۔

کلامِ غالب

سے

صنایع بدایع لفظی کی مثالیں

باب پنجم

صنایع بدائع لفظی

۱. صنعت تجنیس تام

تعریف - کلام میں ایسے دو یا دو سے زیادہ الفاظ لانا جو حروف کی نوع تعداد، ترتیب اور حرکات و سکنات میں بالکل ایک جیسے ہوں۔ مگر معنی میں مختلف ہوں۔ اگر ایک ہی نوع سے ہوں تو یہ تجنیس تام مماثل ہو گی اور اگر دونوں لفظوں کی نوع مختلف ہو۔ یعنی ایک اسم ہو دوسرا فعل تو یہ تجنیس تام مستوفی کہلائے گی۔ مثلاً

(ل) تجنیس تام مماثل ؎

آدمی کہتے ہیں جسکو ایک پتلا کل کا ہے
پھر کہاں کل اس کو گر کل ہو ذرا بگڑی ہوئی (ظفر)

(ب) تجنیس تام مستوفی ؎

کہا دل نے مرے دیکھی جو وہ مانگ
کہ ہے یہ رات آدھی کچھ دعا مانگ (انشاء)

کلام غالب سے مثالیں:- (ل) تجنیس تام مماثل

(۱) بھیجی ہے جو مجھ کو شہ جمجاہ نے دال ہے لطف و عنایات شہنشاہ پہ دال

(۲) دل کو میں اور مجھے دل محو وفا رکھتا ہے	کس قدر ذوقِ گرفتاری ہم ہے ہم کو
(۳) جان دی دی ہوئی اسی کی تھی	حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا
(۴) ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں	ورنہ کیا بات کر نہیں آتی
(۵) کھینچے گرانیِ اندیشہ چمن کی تصویر	سبز مثلِ خط نوخیز ہو خطِ پرکار
(۶) گرہ سے اور گرہ کی امید کیوں نہ پڑے	کہ ہر گرہ کی گرہ میں ہیں تین چار گرہ
(۷) در بذل لآلی ورقم دست کریم است	نی نی نیِ کلکم رگِ مژگان یتیم است
(۸) گر باندازہ سرمایہ کند جلوہ گری	اندر آئینہ ہر آئینہ نگنجد تمثال !
(۹) بزتابم آرزوئی چارہ دل خستگی	تکیہ کردم بر علی تا تکیہ بر بستر زدم
(۱۰) اے لب بتو صحن نالۂ جانکاہ ساز دہ	اے حسر بغصہ خاک حسر بہ جزا رشو

۲- تجنیس تام مستوفی

(۱) کیا کس نے جگرداری کا دعویٰ	شکیب خاطر عاشق بھلا کیا
(۲) اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل	سیلاب گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
(۳) کیا کیا خضر نے سکندر سے	اب کسے رہنما کرے کوئی

کیا (اسم استفہام) اور کیا (فعل ماضی مطلق)

۳- تجنیس مرفو

تعریف - دو متجانس الفاظ میں سے ایک مفرد ہو اور دوسرا مرکب۔ اس میں اور تجنیس مرکب میں فرق یہ ہے کہ تجنیس مرکب میں ایک لفظ مفرد ہوتا اور دوسرا پورے دو لفظوں سے مرکب ہوتا ہے۔ تجنیس مرفو میں ایک لفظ مفرد اور دوسرا کسی ایک لفظ کا کچھ حصہ۔ یعنی ایک دو حروف مثلاً وغیرہ - غل تھا کہ اب معالجتِ جسم و جان نہیں۔

و تیغ برق دم کا قدم درمیاں نہیں۔

کلام غالب سے مثالیں :-

۱۔ بتی دارم از اہلِ دل رم گرفتہ
بشوخی دل از خویشتن ہم گرفتہ

۲۔ زمن پس از دو سہ تسلیم یک نگہ وا نگر
ز خود پس از دو سہ دشنام یک سخن یاد آر

۳۔ ببام و در ز ہجوم جوان و پیر بگوی !
بکوی و برزن از اندوہ مرد و زن یاد آر

۴۔ یہ ضد کہ آج نہ آئے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کس قدر ہے کیا کہیے

۵۔ زآب مہر مہر منو چہر چہرہ را
حاصل جمال یوسف و قرب کلیم باد

۶۔ گھس مل کے چشم شوق قدم بوس ہی سہی
وہ بزم غیر میں ہی ہوں ، پر ازدحام ہو

۷۔ مطرب دل نے مرے تارِ نفس سے غالب
ساز پر رشتہ پے نغمہ بیدل باندھا

۴ : تجنیس محرّف

یعنی دو لفظوں کا بہمہ وجوہ (نوع ، تعداد ، ترتیب حروف) ایک جیسا ہونا لیکن حرکات و سکنات (یعنی اعراب) کے لحاظ سے مختلف ہونا ۔ مثلاً

انیس سے — پہنچا جو مہر مہر سے فرمانِ عزلِ شب
گردوں پہ عاملانِ سحر کا ہوا نصب

مومن سے — پر بھی نہ پوچھا کبھی صیاد نے
کون رہا ، کون رہا ہو گیا

کلام غالب سے مثالیں :۔

۱۔ میں بلاتا تو ہوں اس کو مگر اے جذبۂ دل
اُس پہ بن جائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

۲۔ جو آؤں سامنے ان کے تو مرحبا نہ کہیں
جو جاؤں واں سے کہیں کو تو خیر باد نہیں

۳۔ اس کی امت میں ہوں میں میرے رہیں کیوں کام بند
واسطے جس شہ کے غالبؔ گنبد بے در کھلا

۴۔ مقطع این قطعہ زیں مصرع مصرع باد و بس
ہر چہ در گفتار فخر تست آں ننگ من است

۵۔ نواب مہر مہر منو چہر چہر را
حاصل جمال یوسف و قرب کلیم باد

۶۔ سودیست کانرا بود بود ہیچ !
زیاں ہیچ و سرمایہ و سود ہیچ !

۷۔ ای برتر از سپہر بلند آستان تو
تو پاسبان ملک و ملک پاسبان تو

۵۔ تجنیس زاید و ناقص

تعریف :۔ دو متجانس الفاظ میں سے ایک لفظ کا دوسرے لفظ سے ایک حرف کم یا زیادہ ہو۔ تو یہ تجنیس زاید و ناقص کہلاتی ہے۔ مثلاً بات اور نبات۔ جبل اور جبلا بال اور وبال۔ تیل اور تیل۔ رات اور برات۔ روز اور روزہ وغیرہ۔

کلام غالب سے مثالیں :۔ غالب نے اس صنعت کو بہت زیادہ پیش نظر رکھا۔

۱۔ رہزنی ہے کہ دلستانی ہے لیکے دل دلستاں روانہ ہوا

۲۔ یہ نیم غمزہ ادا کر حق ودیعت ناز نیام پردہ زخم جگر سے خنجر کھینچ

۳ تیرے سروِ قامت سے اک قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

۴۔ گر خامشی سے فائدہ اخفائے حال ہے
خوش ہوں کہ میری بات سمجھنی محال ہے

۵۔ متقابل ہے مقابل میرا
رک گیا دیکھ روانی میری

۶۔ نقشِ نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب
پائے طاؤس پئے خامہ مانی مانگے

۷۔ تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری تیغِ خصم نیام

۸۔ عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ مجھ کو ناز تھا وہ دل نہیں رہا

۹۔ نہیں ہے سایہ کہ سن کر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر در و دیوار

۱۰۔ ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا
وگرنہ شہر میں غالب کی آبرو کیا ہے

۱۱۔ نہیں ذریعۂ راحت جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے جس کو دلکشا کہیے

۱۲۔ گر تجھ کو ہے یقینِ اجابت دعا نہ مانگ
یعنی بغیر یک دلِ بے مدعا نہ مانگ

۱۳ رہا بلا میں بھی مبتلائے آفتِ رشک
بلائے جاں ہے ادا تیری اک جہاں کیلئے

۱۴۔ غیر کی مرگ کا غم کیلئے اے غیرتِ ماہ
ہیں ہوس پیشہ بہت وہ نہ سہی اور سہی

۱۵۔ کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

۱۶۔ ایک عالم پہ ہیں طوفانی کیفیتِ فصل
موجۂ سبزۂ نوخیز سے تا موجِ شراب

۱۷۔ دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کس قدر دشمن ہے دیکھا چاہیئے

۱۸ فنِ صورت گری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

۱۹۔ جی میں کچھ نہیں ہے ہمارے وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

۲۰۔ ہے ہوا میں شراب کی تاثیر
بادہ نوشی ہے بادپیمائی

۲۱۔ بر مدارا اگر مدار نہم
کاخِ الفت توی اساس کنم

۲۲۔ ہم بر روئے تو مائلم مائل
کایں گل و باغ و بوستانِ من است

۲۳ ہم ز کلکِ تو خوشدلم خوشدل
کاں نہال ثمر فشانِ من است

۲۴۔ مہر و مہ صرفِ آب و گل کردند
تا بیاراستند پیکرِ تو

۲۵ نیست در بذلہ کس قرینۂ من
نیست در بذل کس برابرِ تو

۲۶ اندریں روز دل افروز بود عید سعید — عید فرخنده فرخ رخ ماه شوال

۲۷ ہمچو مژگاں کہ دمم بدمم جنید — ہرگز آرام ہیچگاه نداشت

۲۸ در نظرم روی بہ از مہ خوش است — بادہ بدیں وجہ موجہ خوش است

۲۹ ای اساس عالم و اعیاں بہ پیوند الف — ہمچناں بر صورت علم دعیاں انداختہ

۳۰ گر ہمیں ریو و غرلیو درنگ نیرنگ است و بس — ہر کجا تیغے است کافر ماجرائش می نویس

۳۱ غالب الف ہماں الفِ وحدت درخور است — بر لا چہ برفزود گر الا نوشتہ ایم

۳۲ طفل است و تند خوی ببینم چہ میکند — رامم و لے بعربدہ دانستہ رم کنم

۳۳ گردون وبال گردن من ساخت تہمت — کو دست تا بگردن دلدار خم کنم

۳۴ غالب سر و کارم بگدائی بہ کریم است — گر دایہ من دیدہ رسیدہ دامے ندارم

۳۵ بشنو کہ غالب از تو رسید و بکعبہ رفت — گفتی شگفتی کہ بود ناشنودہ کو

۳۶ شاہا بہ بزم جشن چوں شاہاں شراب خواہ — در بحساب بخش و قدح بحساب خواہ

۳۷ دی بہ ہنگامہ ہنگام فرو رفتنِ مہر — روی ابروی نمود از افق چرخ ہلال

۳۸ خلد بغالب سپار زانکہ بداں روضہ در — نیک بود عندلیب خاصہ نوائیں نوا

۳۹ باز برآنم کہ نیاز آورم — رخ بتماشا گہ ناز آورم

۴۰ دلم ہمچو غالب بغم شاد باد — دریں کنج ویرانہ آباد باد

٦ تجنیس مذیل

دو متجانس الفاظ میں سے ایک کے آخر میں دو حروف کا زیادہ ہونا تجنیس مذیل میں ایک لفظ کے آخر میں ہی دو حروف زیادہ ہوتے ہیں نہ پہلے اور نہ ہی درمیان میں اس کے برعکس تجنیس زائد و ناقص میں ایک حرف کی کمی بیشی تینوں صورتوں میں یعنی پہلے، درمیان میں یا آخر میں جائز ہے۔

مثال تجنیس مذیل کی ذوق سے ہمگ سے اس کی مانگتی ہے بھیک
مہ کا کاسہ لیے شب تاریک

کلام غالب سے مثالیں :-

۱	کیا رہوں غربت میں خوش جب ہو حوادث کا یہ حال	نامہ لاتا ہے وطن سے نامہ بر اکثر کھلا
۲	داں ہر بت پیغارہ جو زنجیر رسوائی	عدم تک بے وفا چرچا ہے تیری بے وفائی کا
۳	آبرو کیا خاک اس گل کی جو گلشن میں نہیں	ہے گریباں ننگِ پیراہن جو دامن میں نہیں
۴	لے گئی ساقی کی نخوت قلزم آشامی مری	موجِ مے کی آج رگ مینا کی گردن میں نہیں
۵	ہم کو ستم عزیز ستمگر کو ہم عزیز	نامہرباں نہیں ہے اگر مہرباں نہیں
۶	گمانِ زیست بود بر منت ز بیدردی	بد است مرگ ولے بدتر از گمانِ تو نیست
۷	بہ آئینہ چوں اعتقاد ایں بود	نیوش و نیوشاں کہ داد ایں بود
۸	در اندیشہ پیدا و پنہاں توئی	گل و بلبل و گلشن آرا توئی
۹	در راہِ عشق سینہ زمیں سای دیدہ ایم	آں ناقہ را کہ کوہ بہ کوہاں برابر است

۷ - تجنیس مضارع

دو متجانس الفاظ میں صرف ایک حرف کا جو قریب المخرج یا متحد المخرج ہو مختلف ہونا مثلاً علم اور حلم۔ برق اور فرق۔ باج اور تاج۔ برسوں اور پرسوں وغیرہ۔

کلام غالب سے مثالیں :-

۱	گھستے گھستے مٹ جاتا آپ نے عبث بدلا	ننگِ سجدہ سے میرے سنگِ آستاں اپنا
۲	اب مہر میں اور برق میں کچھ فرق نہیں ہے	گرتا نہیں اس رو سے کہو برق نہیں ہے
۳	بلند رتبہ وہ حاکم وہ سرفراز امیر	کہ باج تاج سے لیتا ہے جسکا طرفِ کلاہ
۴	یہ ترکتاز سے برہم کریگا کشورِ روس	یہ لیگا بادشہِ چین سے چھین تخت و کلاہ
۵	فرش سے تا عرش واں طوفاں تھا موجِ رنگ کا	یاں زمیں سے آسماں تک سوختن کا باب تھا
۶	کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو پر اب	دیکھا تو کم ہوئے پہ غمِ روزگار تھا
۷	ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں	کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
۸	فریاد کی کوئی لے نہیں ہے	نالہ پابندِ نے نہیں ہے

۹ کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ — کہ بیتابی میں ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۱۰ چوں عطای تو بود پاک ز تحریم چہ باک — می حرام است ولی ہیچ زمم اند وجہ حلال

۱۱ بہ بام و در زند ہجوم جواں و پیر بگوی — بگوی و بہ زن از اندوہ مرد و زن باد آر

۱۲ آں سروِ سایہ دار کہ بارش نبود گو — واں زگل شگفتہ کہ خارش نبود کو

۱۳ ایا ستم زدہ غالب رہا کنش سگال — منہ بہ سینہ بے کینہ از شکایت داغ

۱۴ زیں مایہ از کجا کہ ننالد بخویشتن — ہر گنجِ شایگاں کہ بود رایگان اوست

۱۵ آفریں بہ روانِ پاکش باد — مہر از ذرہ ہائے خاکش باد

۱۶ قدح را بہ پیمودن مے گمار — نفس را بفرسودن نے گمار

۸ — تجنیس لاحق

دو متجانس الفاظ میں سے ایک ایسے حرف کا مختلف ہونا جو قریب المخرج یا متحد المخرج نہ ہو۔ مثلاً نوٗر اور نار۔ رام اور روم۔ مور اور مار۔ پتلا اور پتلی دیہ اور دوٗر وغیرہ

کلامِ غالب سے مثالیں۔

۱۔ نشہ کے پردے میں ہے محوِ تماشائے دماغ — بسکہ رکھتی ہے سرِ نشو و نما موجِ شراب

۲۔ نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں — گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

۳ ہوں کشمکشِ نزع میں ہاں جذبِ محبت — کچھ کہہ نہ سکوں پر وہ مرے پوچھنے کو آئے

۴۔ مملکتِ کمال میں ایک امیر نامور — عرصۂ قیل و قال میں خسرو نامدار ایک

۵ اے بخلا و ملا ذاتِ تو ہنگامہ زا — با ہمہ در گفتگو بے ہمہ در ماجرا

۶ غالبؔ اگر بہ بزمِ شعر دیر رسید و زود زیست — کش بفراقِ حسرتی مل ز سخنوری گرفت

۷ داشت لیکن ز روی رای صواب — در دل اندیشہ زیں گناہ نداشت

۸ دارم سرِ ایں رشتہ بدانساں کہ ز دیرم — تا کعبہ ز تار برم بزنار کشیدن

۹ نامہ در نیمۂ راہ بود کہ غالب جاں داد — ورق از ہم در و ایں مژدہ زبانی بشنو

۹ — تجنیس قلب

دو متجانس الفاظ کی ترتیب میں اختلاف کا ہونا۔ جس لفظ کی ترتیب میں یہ اختلاف پایا جاتا ہے، اسے مقلوب کہتے ہیں اور مقلوب کی دو صورتیں ہوتی ہیں مقلوب بعض اور مقلوب کل مقلوب بعض میں ایک دو حروف میں اختلاف ہوتا ہے۔ اور مقلوب کل میں حروف کی ساری ترتیب الٹی ہوتی ہے۔ مثلاً رام اور مار مقلوب کل ہیں۔ لیکن مرحوم اور محروم مقلوب بعض ہیں۔

کلام غالب سے مثالیں :-

ا مقلوب کل

۱ — قضا بنائے خرابی فگندہ ہم ز نخست
ندیدہ کہ ہماں عکس غالب ان بد غ (غالب در بداغ)

۲ — نہ بینی برگ رز زر گشت وگل کبریت احمر شد
کند پائیز گوئی کیمیاگر باغبانان را (رز اور زر)

ب مقلوب بعض

۱ لاکھ عقدے دل میں تھے لیکن ہر ایک
میری حد وسع سے باہر کھلا (لاکھ اور کھلا)

۲ خدا نے تجھ کو عطا کی ہے گوہر افشانی
درحضور پہ اے ابر بار بار برس (ابر اور بار)

۳ آتش گل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام (شیرہ اور ریشہ)

۴ سینہ از اشک جدا دیدہ جدا می سوزد
ایں رگ ابر شرر بار پریشاں سوخت (ابر اور بار)

۵ جستم از جائی دلی ہوش وخرد پیشا پیش
رفتم از خویش ولی علم وعمل ہر شاد وش (علم اور عمل)

۶ خیرہ کند مرد را مہر درم داشتن (درم اور مرد)
حیف ز ہیچو خودی چشم کرم داشتن

۷ در خم دام بلا بال فشاں زیستن (بلا اور بال)
با سرِ زلف دوتا عربدہ ہم داشتن

۸ مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل (کلام۔ کامل)

۱۰ تجنیس خطی

متجانس الفاظ کا بغیر رعایت نقاط کے مشابہ ہونا۔ یعنی اگر حروف منقوطہ پر نقطے نہ ڈالے جائیں تو دونوں الفاظ ایک جیسے نظر آئیں مثلاً خط اور حظ، غرق اور عرق، عنبر اور عبیر، مشکیں اور نمکیں وغیرہ یہ صنعت بھی غالب کے کلام میں کثرت سے ملتی ہے۔ ہم چند مثالوں پر ہی اکتفا کرتے ہیں۔

۱	ہر چند سبک دست ہوئے بت شکنی میں	ہم ہیں تو ابھی راہ میں ہیں سنگ گراں اور
۲	صفائے حیرتِ آئینہ ہے سامانِ زنگ آخر	تغیر آب بر جا ماندہ کا پاتا ہے رنگ آخر
۳	آج ہم اپنی پریشانیِ خاطر اُن سے	کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں
۴	دیکھا اسد کو خلوت و جلوت میں بارہا	دیوانہ گر نہیں ہے تو ہشیار بھی نہیں
۵	پڑیے گر بیمار تو کوئی نہ ہو تیماردار	اور اگر مر جایئے تو نوحہ خواں کوئی نہ ہو
۶	ملتی ہے خوئے یار سے نار التہاب میں	کافر ہوں گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں
۷	کہاں ہے ساقی مہوش کہاں ہے ابرِ مطیر	بیار، لائے گلنار گوں، ببار، برس
۸	بلند رتبہ وہ حاکم وہ سرفراز امیر	کہ باج تاج سے لیتا ہے جس کا طرف کلاہ
۹	باغِ شگفتہ تیرا بساطِ نشاطِ دل	ابرِ بہار خمکدہ کس کے دماغ کا

۱۰۔ یاد باد آں روزگاراں کاعتبارے داشتم — آہِ آتشناک و چشمِ اشکبارے داشتم
۱۱۔ زاغ راغ اندر ہوای نغمہ بال پرزناں — ہمنوای پردہ سنجان چمن خواہد شدن
۱۲۔ گل بوی و شعر گوئی و گہر پاش و شاد باش — مستی ز بانگِ بربط و چنگ و رباب خواہ
۱۳۔ دلی تاب ورسجود نیابم کنوں — صریر قلم بر نتابم کنوں

۱۱- صنعت اشتقاق

کلام میں ایسے الفاظ جمع کرنا یا لانا جو ایک ہی مادہ سے یا ایک ہی مصدر سے مشتق ہوں۔ مثلاً علم، عالم، معلم، معلوم، تعلیم وغیرہ یا شاہد، شہادت، شہود، مشہود وغیرہ یہ صنعت بھی کلام غالب میں کثرت سے استعمال ہوئی ہے۔ ہم صرف چند مثالیں درج کریں گے۔

۱۔ اصل شہود و شاہد و مشہود ایک ہے — حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں
۲۔ شاد و دلشاد و شادماں رکھیو — اور غالب پہ مہرباں رکھیو
۳۔ سبد گل کے تلے بند کرے ہے گلچیں — مژدہ اے مرغ کہ گلزار میں صیاد نہیں
۴۔ زبانِ اہلِ زباں میں ہے مرگ خاموشی — یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانیِ شمع
۵۔ مجھ کو پوچھا تو کچھ غضب نہ ہوا — میں غریب اور تو غریب نواز
۶۔ مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی — موت آتی ہے پر نہیں آتی
۷۔ اے شاہِ جہانگیر و جہاں بخش و جہاندار — ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
۸ پوچھ مت رسوائی اندازِ استغنائے حسن — دست مرہونِ حنا، رخسارہ رہنِ غازہ تھا
۹ مفت کا کس کو بُرا ہے بدرقہ — رہروی میں پردۂ رہبر کھلا
۱۰ جو تجھ کو ہے سرِ سودائے انتظار تو آ — کہ ہیں دکانِ متاعِ نظر در و دیوار
۱۱ زمزم پہ ہی چھوڑو مجھے کیا طوفِ حرم سے — آلودہ جامۂ احرام بہت ہے
۱۲ فکر اچھی پر ستائش نا تمام — عجزِ اعجازِ ستائش گر کھلا
۱۳ بر سرِ راہش نشستم بر درش راہم نبود — خویش را از خویشتن لختی نکوتر داشتم
۱۴ ہر کجا غالب تخلص در غزل بینی مرا — می تراش آں را و مغلوبِ سجایش می نویس

۱۲ صنعت شبہ اشتقاق

کلام میں ایسے دو الفاظ لانا جو بظاہر ایک ہی مادہ سے مشتق معلوم ہوں مگر ذرا تامل کے بعد معلوم ہو جائے کہ دونوں ایک اصل سے نہیں ہیں۔ مثلاً شاعری اور شعار، آرام اور رم وغیرہ کلام غالب سے مثالیں :-

۱ خانہ ویراں سازی حیرت تماشا کیجیے صورتِ نقشِ قدم ہوں رفتۂ رفتارِ دوست

۲ جی جلے ذوقِ فنا کی ناتمامی پہ نہ کیوں ہم نہیں جلتے نفس ہر چند آتش بار ہے

۳ وحشی بن صیاد نے ہم رم خوردوں کو کیا رام کیا رشتۂ چاکِ جیب دریدہ صرفِ قماش دام کیا

۴ چو خود را ذرہ گویم رہ نجد از حرفم زبی طالع زخودی راندم بے مہر نازم مہربانی را

۵ (مہر دسورج) مہربانی (نوازش)

۵ سرو چمن سروری افتاد زپا ای شد غرقہ بخون پیکر شاہ شہدا ای

۱۳- ردّ العجز علی الصدر

علم عروض میں کسی شعر کے پہلے مصرع کے پہلے نصف حصہ کو صدر کہتے ہیں اور پہلے مصرع کے دوسرے نصف حصہ کو عروض کہتے ہیں۔ مصرع ثانی کے حصہ اول کو ابتدا اور نصف آخر کو عجز کہتے ہیں۔

(ل) ردّ العجز علی الصدر سے یہ مراد ہے کہ جو لفظ عجز (مصرع ثانی کا آخری حصہ) میں لایا جائے۔ وہی صدر (مصرع اول کا نصف اول) میں لایا جائے۔ مثلاً حالی

قیصر کے گھرانے پہ رہے سایہ یزداں اور ہند کی نسلوں پہ رہے سایہ قیصر

(ب) ردّ العجز علی العروض۔ جو لفظ مصرع ثانی کے آخر (عجز) میں آئے وہی مصرع اول کے نصف آخر میں لایا جائے۔ مثلاً میر حسن

- بھری تھی دلوں سے زبس اس کی مانگ بہت دل لئے اس کی کنگھی نے مانگ

(ج) ردّ العجز علی الابتدا۔ جو لفظ عجز میں آئے وہی ابتدا (مصرع ثانی کا نصف اول)

میں آئے مثلاً ناسخ

کر رہا ہے ایک کافر مجھ کو قتل　　　الغیاث اے اہل ایماں الغیاث

(د) ردّ العجز علی الحشو، جو لفظ عجز میں (یعنی مصرع ثانی کے آخر میں) لایا جائے وہ پہلے یا دوسرے مصرع کے کسی حصے میں لایا جائے۔ مثلاً ناسخ

وصل میں تھا صبح سے بیزار میں　　　ہجر کی شب مجھ سے ہے بیزار صبح

ردّ العجز کی یہ چاروں صورتیں تقریباً ہر شاعر کے کلام میں پائی جاتی ہیں۔ کلام غالب سے ہر صورت کی دو دو چار مثالیں پیش کی جاتی ہیں۔

(ا) ردّ العجز علی الصدر

۱　نہیں کہ مجھ کو قیامت کا اعتقاد نہیں
شب فراق سے روز جزا زیاد نہیں

۲　چاہیئے اچھوں کو جتنا چاہیئے
یہ اگر چاہیں تو پھر کیا چاہیئے

۳　کیا کس نے جگرداری کا دعوی
شکیب خاطر عاشق بھلا کیا

۴　سر آئے شان شکستہ بیچو گان زبے تنی
تنہائے شان فتادہ بمیداں زبے سری

ب :۔ ردّ العجز علی العروض :۔

۱　بھیجی ہے جو مجھ کو شہ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایاتِ شہنشہ پہ دال

۲　تجاہل پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تک اے سراپا ناز کیا کیا

۳　خط کے آنے سے ہوا ہے سر جو بازار دوست
دودِ شمع کشتہ تھا شاید خط رخسار دوست

پھر ہوا وقت کہ ہو بال کشا موجِ شراب
دے بطِ مے کو دل و دستِ شنا موجِ شراب

ج :- ردّ العجز علی الابتدا

۱۔ وہ بھی دن ہو کہ اس ستمگر سے
ناز کھینچوں بجائے حسرتِ ناز

۲ غافل ان مہ طلعتوں کے واسطے
چاہنے والا بھی اچھا چاہیئے

۳ تیغ در کفِ کفِ بب آتا ہے قاتل اسطرف
مژدہ باد اے آرزوئے مرگ غالب مژدہ باد

۴ زہے نگاہ بکسیر و شرم و دور اندیش
بکیے بدزدی دل رفت و پردہ وا بیکے

(د) ردّ العجز علی الحشو :-

۱۔ آصف کو سلیماں کی وزارت سے شرف تھا
ہے فخرِ سلیماں جو کرے تیری وزارت

۲۔ ہم پکاریں اور کھلے یوں کون جائے
یار کا دروازہ گر پائیں کھلا

۳۔ گلشنِ اتفاق میں ایک بہارِ بے خزاں
میکدۂ وفاق میں بادۂ بے خمار ایک

۴۔ ردا رکھو نہ رکھو جو لفظ تکیہ کلام
اب اس کو کہتے ہیں اہلِ سخن "سخن تکیہ"

۱۴۔ صنعت قطار البعیر

بعیر اونٹوں کو کہتے ہیں۔ اور اونٹوں کی قطار عموماً یوں ہوتی ہے۔ کہ ہر اونٹ کی نکیل اگلے اونٹ کی دم سے بندھی ہوتی ہے اور سب سے اگلے اونٹ پر ساربان بیٹھا اسے چلا رہا ہوتا ہے شعر میں یہ صنعت یوں ہے۔ کہ ایک مصرع کے آخر میں جو لفظ آئے۔ وہی دوسرے مصرع کے اول میں لایا جائے یعنی پہلے مصرع کا آخری لفظ اور دوسرے مصرع کا پہلا لفظ ایک ہو۔ مثلاً

ہو گیا جس دن سے اپنے دل پہ اس کا اختیار
اختیار اپنا گیا، بے اختیاری رہ گئی (ظفر)

کلام غالب سے قطار البعیر کی مثالیں:۔

(۱) بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ — کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی
(۲) رہے اس شوخ سے آزردہ ہم چندے تکلف سے — تکلف برطرف تھا ایک انداز جنوں وہ بھی
(۳) من ز خود رفتۂ رسائی عقل — عقل دلدادۂ بیان من است
(۴) سرہائے شاں شکستہ ز چوگان بے تنی — تنہائے شاں فتادہ بمیداں ز بے سری
(۵) ایا محیط فضائل کرتا تو در نظری — نظر بشوکت دارا و کیقباد م نیست
(۶) حق کہ حقیقت سمیع است ملائی بشنو — بشنو گر تو خداوند جہانی بشنو
(۷) اگر بطالع من سوخت خرمنم چہ عجب — عجب ز قسمت یک شہر خوشہ چیں دارم

۱۵۔ صنعت ترافق

کسی شعر کے دونوں مصرعوں کا یا کسی رباعی کے چاروں مصرعوں کا اس طرح سے ہونا کہ جس مصرع کو چاہیں۔ مصرع اول یا دوم یا سوم یا چہارم بنا لیں۔ اور شعر کے معنوں میں یا سلاست اور روانی میں کوئی فرق نہ آئے۔ مثلاً تاثیر کا یہ شعر

اگلے وقتوں کے شاعران کرام — کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے

اسے یوں پڑھیں تو بھی درست ہے اتا بیٹرنے دونوطرح سے دو غزلیں کہی ہیں۔

کس قدر خوش نصیب ہوتے تھے　　اگلے وقتوں کے شاعران کرام

کلام غالب سے صنعت تزانق کی مثالیں :-

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجیے
ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کیجیے

۲ آفرینش کو ہے واں سے طلبِ مستی ناز
عرض خمیازہ ایجاد ہے ہر موجِ بہار

۳ تو اور آرائشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ ہای دُور دراز

۴ اے ترا غمزہ، یک قلم انگیز
اے ترا ظلم سر بسر انداز

۵ اے شہنشاہ آسماں اورنگ
اے جہاندار آفتاب آثار

۶ تھا میں اک بینوائے گوشہ نشیں
تھا میں اک دردمند سینہ فگار

۷ ہمسایہ اقبال لوائے تو بلندی
وابستہ اندازِ کمند تو رسائی

۸ فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

۹ اے شہنشاہ فلک منظرِ بے مثل و نظیر　　اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

۱۰ پانوں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ　　فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

۱۱ تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہیں　　تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی دلیل

۱۲ تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید　　تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

۱۶۔ صنعتِ سیاق الاعداد

کلام میں ترتیب سے یا بغیر ترتیب کے دو یا دو سے زیادہ اعداد کا لانا۔ مثلاً

ترتیب سے :- ایک دو تین چار پانچ چھ سات

آٹھ نو دس ہوئے بس انشا بس (انشا)

بغیر ترتیب کے :- ہیں قتل عام کرتے وہ اغیار کے لیے

دس بیس روز مرتے ہیں دو چار کے لیے (مومن)

کلام غالب سے مثالیں :-

۱ الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ ؛ جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

۲ اُسے کون دیکھ سکتا کہ یگانہ ہے وہ یکتا جو دوئی کی بو بھی ہوتی تو کہیں دو چار ہوتا

۳ مے عشرت کی خواہش ساقی گردوں سے کیا کیجے لیے بیٹھا ہے اک دو چار جام واژگوں وہ بھی

۴ وہ کہ جس کی صورت تکوین میں مقصد نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

۵ دونو کے دل حق آشنا دونو رسول پہ فدا ایک محب چار یار عاشق ہشت و چار ایک

۶ سبزۂ نہ چمن و یک خط پشت لب بام رفعت ہمت صد عارف و یک اوج حصار

۷ غالب چو شخص و عکس در آئینہ خیال باخویشتن یکے و دو چار خودیم ما

۸ زمن بپس از دو دستہ تسلیم یک نگہ وانگہ زخود بپس از دو دستہ دشنام یک سخن یاد آر

۹ رباعی :-

اے آنکہ ترا سعی بہ ادمان من است منعم مکن از بادہ کہ نقصان من است

حیف است کہ بعد من بمیراث رود ایں یک دو دستہ خم کہ در شبستان من است

۱۰ وداع و وصل جداگانہ لذتی دارد ہزار بار برو صد ہزار بار بیا

۱۷۔ صنعت مسمط یا مسجع

غزل یا قصیدہ میں دو دو یا تین تین فقرہ ہائے ہموزن یا ہم قافیہ ایک طرح کے مذکور کریں اور چوتھا قافیہ اصل غزل یا قصیدہ کا ہو۔ اس قسم کی مسجع غزل یا قصیدہ سے شاعر کی قوت طبع اور قادر الکلامی کا اظہار ہوتا ہے۔ مثلاً امیر مینائی

راہ عدم کی سیر سے کب رنج اٹھائے تیر سے
پہنچے ہیں پائے غیر سے سوتے ہوئے منزل کے پاس
ساقی کو حیرت ہو گئی، مطرب کو وحشت ہو گئی
برباد صحبت ہو گئی، پہنچا جو میں محفل کے پاس

کلام غالب سے مثالیں:۔ غالب کی کئی غزلیں اور قصائد اس صنعت میں لکھے ہوئے ہیں یہاں چند اشعار پر ہی اکتفا کیا جاتا ہے۔

جب وہ جمال دلفروز صورت مہر نیمروز
آپ ہی ہو نظارہ سوز پردے میں منہ چھپائے کیوں

رات کیوقت مے پئے ساتھ رقیب کو لیئے
آئے وہ یاں خدا کرے پر نہ کرے خدا کہ یوں

گر تیرے دل میں ہو خیال وصل میں ذوق کا زوال
موج محیط آب میں مارے ہے دست و پا کہ یوں

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا اگر استوار ہوتا

غم اگرچہ جانگسل ہے پہ کہاں بچیں کہ دل ہے
غم عشق گر نہ ہوتا غم روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے شب غم بری بلا ہے
مجھے کیا برا تھا مرنا اگر ایک بار ہوتا

ہوئے مر کے ہم جو رسوا ہوئے کیوں نہ غرق دریا
نہ کبھی جنازہ اٹھتا نہ کہیں مزار ہوتا

دانش بمی در باختہ خود را ز من نشناختہ
رخ در کنارم ساختہ از شرم پنہاں در بغل

ناخواندہ آمد صبحگہ بند قبایش بے گرہ
واندر طلب منشور شہ نکشودہ عنواں در بغل

ہاں غالب خلوت نشیں بیمی چناں عیشی چنیں
جاسوس سلطاں در کمیں مطلوب سلطاں در بغل

آں کو بخلوت با خدا ہرگز نکردے التجا
نالاں بہ پیش ہر کسے از جور افلاکش نگر

آں سینہ کز چشمِ جہاں مانندِ جاں بودے نہاں ؎ اینک بہ پیراہن عیاں از روزنِ چاکش نگر

خواند بامیدِ اثر اشعارِ غالب ہر سحر ؎ از نکتہ چینی درگذر فرہنگ و ادراکش نگر

ایکہ بیدہ ام زیست دے کہ بسینہ غم زیست ؎ نازش غم کہ ہم زیست خاطر شادی دہد

می رہیم بخلد جا رحم کجاست اے خدا ؎ آب و ہوای ایں فضا کوئی کہ یادی دہد

۱۸ - صنعت ترصیع

شعر میں دونو مصرعوں کے تمام یا زیادہ سے زیادہ الفاظ کا ہم وزن یا ہم قافیہ ہونا صنعت مسمط دو دو یا تین تین الفاظ ہم وزن یا ہم قافیہ ہوتے ہیں لیکن ترصیع میں دونو مصرعوں کے تقریباً تمام الفاظ ہم وزن یا ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ صنعت ترصیع میں جو غزل یا قصیدہ لکھا جاتا ہے۔ اسے مرصع کہتے ہیں۔ مرصع غزل یا قصیدہ سے شاعر کا کمالِ فن ظاہر ہوتا ہے۔ غالب کے اردو اور فارسی کلام میں صنعت ترصیع کی بہت مثالیں ہیں۔ ان میں سے چند اشعار یہاں نقل کئے جاتے ہیں۔

ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی ؎ مطرب بہ نغمہ رہزنِ تمکین و ہوش ہے

انہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے کیوں لڑیئے ؎ ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے کیا کہیئے

حسد سزائے کمالِ سخن ہے کیا کیجئے ؎ ستم بہائے متاعِ ہنر ہے کیا کہیئے

بیدلی ہائے تماشا کہ نہ عبرت ہے نہ ذوق ؎ بیکسی ہائے تمنا کہ نہ دنیا ہے نہ دیں

ہرزہ ہے نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم ؎ لغو ہے آئینۂ فرقِ جنون و تمکیں

مرحبا اے سرورِ خاصِ خواص ؎ حبذا اے نشاطِ عامِ عوام

ہے مجھے آرزوئے بخششِ خاص ؎ گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

اے شہنشاہِ فلک منظرِ بے مثل و نظیر ؎ اے جہاندارِ کرم شیوۂ بے شبہ و عدیل

پاؤں سے تیرے ملے فرقِ ارادت اورنگ ؎ فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت اکلیل

تیرا اندازِ سخن شانۂ زلفِ الہام ؎ تیری رفتارِ قلم جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم ؎ تجھ سے دنیا میں بچھا مائدۂ بذلِ خلیل

بہ سخن اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ ؎ بہ کرم داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر — تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا ثور سے جانا باہر — زہرہ نے ترک کیا حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش مری اصلاحِ مفاسد کی رہین — تیری بخشش مری انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم مرے جینے کی نوید — تیرا اندازِ تغافل مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجھ کو اماں — چرخِ کج باز نے چاہا کہ کرے مجھ کو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ — پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم — کششِ دم نہیں بے ضابطۂ جرِ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی — غمِ گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

فکر میری گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر — کلک میری رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

نیک ہوتی مری حالت تو نہ دیتا تکلیف — جمع ہوتی مری خاطر تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں خستہ نوازی میں یہ دیر — کعبۂ امن و اماں عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل

فیضِ حق را کمینہ شاگردیم — عقلِ کل را بہینہ فرزندیم

ہم بتابش بہ برق ہم نفسیم — ہم بہ بخشش بہ ابر مانندیم

تبلاشیکہ ہست فیروزیم — بمعاشیکہ نیست خورسندیم

ہمہ برخویشتن ہمی گرییم — ہمہ بر روزگار می خندیم

جس کا ہر فعل صورتِ اعجاز — جس کا ہر قول معنیِ الہام

شہسوارِ طریقۂ انصاف — نوبہارِ حدیقۂ اسلام

اے ترا لطفِ زندگی افزا — اے ترا عہد فرخی فرجام

مرحبا موشگافیِ ناوک — آفریں آب داریِ صمصام

تیر کو تیرے تیرِ غیر ہدف — تیغ کو تیری خصم نیام

ہے ازل سے روائیِ آغاز — ہو ابد تک رسائیِ انجام

۱۹۔ صنعت لزوم مالایلزم یا صنعت التزام

کسی ایک امر یا چند ایسے امور کا جو ضروری نہ ہوں غزل یا قصیدے کے ہر شعر میں التزام کرنا۔ مثلاً ابوظفر بہادر شاہ کی ایک غزل میں یہ التزام کیا گیا ہے کہ ہر شعر کے دوسرے مصرع میں پانچ پانچ چیزوں کے نام آتے ہیں۔ اس غزل کے دو شعر یہ ہیں۔

ہمیشہ رنج تنہائی میں ہم مونس سمجھتے ہیں
الم کو یاس کو حسرت کو بے تابی کو حرماں کو

لب و دنداں نے تیرے کر دیا بے قدر عالم میں
گہر کو لعل کو ہیرے کو در یاقوت و مرجاں کو

غالب کے کلام میں یہ صنعت بہت کم پائی جاتی ہے۔ تاہم اس کا کلام اس سے خالی نہیں۔ ایک باغ کی تعریف کرتے ہیں اور اشعار میں نسیم اور صبح کا تلازمہ ہے۔

مراد بیخودی نظارہ گاہیست — تعالیٰ شانہ اللہ اکبر
نہ باغستی کہ در پہناش بینی — گل و ریحان و شمشاد و صنوبر
صباحش چوں دل عارف منزہ — نسیمش چوں دم غالب معنبر
نسیمش رنگ و بوی ہفت گلشن — صباحش آبروی ہفت کشور
نسیمش چوں دم عیسیٰ رواں بخش — صباحش چوں کف موسیٰ منور
صباحش را سرشت از غازہ حور — نسیمش را نہاد از موج کوثر
صباحش را شہودے در مقابل — نسیمش را بہشتے در برابر
دم صبحش ز مہر آئینہ در کف — نسیمش از بہاراں حلقہ در بر
دم صبحش بفیروزی مشخص — نسیمش در دل افروزی مصور

دم صبحش ضیاء الدین احمد
نسیمش ذوالفقار الدین حیدر

ایک قطعہ میں یہ التزام کیا ہے۔ کہ پہلا مصرع لفظ "نہ" سے شروع ہوتا ہے اور آخر تو

شعر اسی طرز میں ہیں۔

نہ چنانم کہ بر عقیدۂ خویش — از فسون کسے ہراس کنم
نہ توانم کہ از نصیحت و وعظ — عالمی را خدا شناس کنم
نہ کہ اخبار باستانی را — دیو افسانہا قیاس کنم
نہ کہ ز آثار ہر چہ مشہور است — اثری تازہ اقتباس کنم
نہ کہ از بہر حلہ ہائے بہشت — ترک آرائش لباس کنم
نہ کہ در عالم فراخ روی — عار از ژندۂ پلاس کنم
نہ بواجب ز سعی در مانم — نہ بہر مدعا مکاس کنم
چون نہ من ساقیم نہ محتسبم — نہ بریزم نہ می بکاس کنم

ایک ترکیب بند میں یہ التزام کیا ہے۔ کہ پہلے بند کے دونو مصرعے حرف ندا "اے" سے شروع ہوتے ہیں۔

اے دل بچشم زخم حوادث فگار شو — اے چشم از تراوش دل اشکبار شو
اے خوں بدیدہ در رو گداز جگر فرست — اے دم بسینہ دود چراغ مزار شو
اے لب بنوحہ نالہ جانکاہ ساز دہ — اے سر بقبضہ خاک سر رہگذار شو
اے خاک چرخ گر نتواں زد زجا در آ — اے چرخ خاک گر نتواں شد غبار شو
اے نو بہار چوں تن بسمل بخوں بغلط — اے روزگار چوں شب بے ماہ تار شو
اے ماہتاب روی بسیلی کبود کن — اے آفتاب داغ دل روزگار شو
اے فتنہ باد صبح وزید ایقدر مخسپ — اے رستخیز وقت رسید آشکار شو

آہ ایں چہ سیل بود کہ مارا ز سر گزشت
تنہا ز سر مگو کہ ز دیوار و در گذشت

۲۰۔ صنعت فوق النقاط و تحت النقاط و صنعت عاطلہ یا غیر منقوطہ

یہ صنعت بھی لزوم مالایلزم کی ایک قسم ہے۔ ایسا کلام جس میں حروف منقوطہ ایسے استعمال کئے جائیں۔ جن کے نقاط حروف کے اوپر آتے ہوں۔ تو اس صنعت کو فوق النقاط کہتے ہیں۔ اور اگر تمام حروف منقوطہ ایسے ہوں۔ کہ ان کے نقاط حروف کے نیچے آئیں۔ تو یہ صنعت تحت النقاط کہلاتی ہے۔ اور اگر ایسے الفاظ استعمال کئے جائیں۔ جو تمام کے تمام غیر منقوطہ ہوں۔ تو یہ صنعت عاطلہ کہلاتی ہے۔

(ا) فوق النقاط :۔

شہر دہلی کا ذرہ ذرہ خاک — تشنہ خوں ہے ہر مسلماں کا

زخاصانت گرامی گوہری ہست — کہ می داند ز اسرار من اندک

در سر من ثنا گر عقلم — در سخن عقل مدح خوان منست

(ب) تحت النقاط :۔

گاہ رو کر کہا کیے باہم — ماجرا دیدہ ہائے گریاں کا

ہوا حکم باورچیوں کو کہ ہاں — ابھی جا کے پوچھو کہ کل کیا پکائیں

(خط منظوم بنام علائی)

(ج) صنعت عاطلہ یا غیر منقوطہ :۔

لکھا کرے کوئی احکام طالع مسعود — کسے خبر ہے کہ واں جنبش قلم کیا ہے (پہلا مصرع)

۲۱۔ صنعتِ مہمّا

شعر میں کسی مطلب کے اظہار کے لیے حروف مفردہ کا لانا۔ مثلاً

رہے گا چار سو ستر برس انشا زمانے میں
کہ اس پہ سچ رہا ہے گا دش وق کا جوڑا

(انشا کے اس شعر میں یہ بھی صنعت ہے کہ ج، ش وق کا مجموعہ بحساب ابجد چار سو ستر بنتا ہے)

کلام غالب سے مثالیں :۔

فنا تعلیم درس بیخودی ہوں اس زمانے سے	کہ مجنوں لام الف لکھتا تھا دیوارِ دبستاں پر
سپہر تابع او باد در جہانداری	دہند تا الف و واؤ تورِ میزاں را
ہمہ عالم عدم و ذاتِ تو برہان وجود	الفی بر سرِ لا چوں بلفظ الا است
لٹے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالبؔ	جادۂ راہ کششِ کافِ کرم ہے ہم کو
وضع میں اس کو اگر سمجھئے قاف تریاق	رنگ میں سبزۂ نوخیز مسیحا کہئے
یک الف بیش نہیں صیقلِ آئینہ ہنوز	چاک کرتا ہوں میں جب سے کہ گریباں سمجھا
ازبس پرست جیب مسمّیٰ ز نقدِ اسم	ہر جا الف نوشت محاسب ہزار یافت

۲۲ ۔صنعت ملمّع یا ذولسانین

کلام میں ایک سے زیادہ زبانیں جمع کرنا۔ ایک مصرع اردو میں ہو تو دوسرا عربی یا فارسی میں۔ یا ایک مصرع فارسی میں ہو تو دوسرا عربی میں ۔مثلاً

شاہ ایراں یہی لکھتا ہے تجھے عرضی میں
بو کہ من ہم زعنایاتِ تو خطے ببرم (انشاء)

کلام غالب سے مثالیں :۔

ذرہ ذرہ ساغرِ میخانۂ نیرنگ ہے
گردشِ مجنوں بچشمکہائے لیلیٰ آشنا

مہرِ تاباں کو ہو تو ہو اے ماہ
قرب ہر روزہ برسبیل دوام

تجھ کو کیا پایہ روشناسی کا
جز بتقریب عید ماہِ صیام

دھوپ کی تابش آگ کی گرمی
وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

مرا در بیخودی نظارہ گا بیست

تَعَالیٰ شَانَہٗ اللّٰہُ اَکْبَر

گردسرِ ایں تام کہ معراج بیانست

سُبْحَانَکَ یَا رَبِّ تَقَدَّس وتعالیٰ

قلم از تازگی مدحِ تو در بارہ خوبش

شارعِ اَنْبَتَہُ اللّٰہ بناتاً حَسَن است

ہے دلبری کمیں گرِ ایجاد یک نگاہ

کار بہانہ جوئی چشم حیا بلند

۲۳ - صنعت تضمین

کسی دوسرے شاعر کے ایک مصرع یا ایک شعر کو اپنے کلام میں استعمال کرنا تضمین کلام کو زیادہ واضح کرنے کے لئے یا زیادہ پر تاثیر کرنے کے لیے یا اپنا زورِ طبع دکھانے کے لیے کی جاتی ہے۔

غالب نے دس گیارہ سال کی عمر میں یعنی پتنگ بازی کے زمانے میں ایک نظم لکھی تھی جس کے آخر میں کسی استاد کے ایک شعر کی یوں تضمین کی۔

دل نے سن کر، کانپ کر کھا پیچ و تاب   غوطے میں جاکر دیا، کٹ کر جواب

"رشتہ" در گردنم انگندہ دوست   می برد ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

اردو کلام میں تضمین کی مثالیں بہت ہی کم ہیں، فارسی میں عرفی فیضی۔ نظیری ظہوری اور سعدی اور حافظ کے اشعار یا مصرعے تضمین کئے گئے ہیں۔ اور بعض اشعار میں صرف یہ اشارہ کر دیا گیا ہے کہ یہ مصرع کسی استاد کا یاد آ گیا ہے۔ اور آگے وہ مصرع لکھ دیا گیا ہے

تضمین مصرع ناسخ ؎

غالب اپنا یہ عقیدہ ہے بقول ناسخ

"آپ بے بہرہ ہے جو معتقدِ میر نہیں"

تضمین مصرع عرفی ؎

گشتم غالب طرف با شربِ عرفی کہ گفت

"روئی دریا سلسبیل و قعرِ دریا آتش است"

تیرے فیل گراں جسد کی صدا | تیرے رخش سبک عناں کا خرام

متفرق اشعار میں تنسیق الصفات

اے شاہ جہانگیر و جہاں بخش و جہاندار | ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
حق گو و حق پرست و حق اندیش و حق شناس | نواب مستطاب امیر شہ احتشام

غالب کے فارسی قصائد میں صنعت تنسیق الصفات کی بہت مثالیں ہیں ان میں سے دو مثالیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

قصیدہ پانزدہم

زہے ز خویش نشان کمال ضلع آلہ | سراج دین نبی بو ظفر بہادر شاہ
محیط بخشش و دریا کف و سحاب نوال | قمر لوای و فلک خرگہ و ستارہ سپاہ
رئیس تاجوراں خسرو جہاں داور | دلیل راہرواں مرشد خدا آگاہ
دم مراقبہ صورت نمای جوہر عقل | گہ مشاہدہ نیروی فرای نور نگاہ

بست و سویں قصیدہ

آں توی خسرو رو شن دل فرزانہ ستائے | ایں منم غالب فرزانہ اعجاز بیاں
کن سخنگوی عطارد دم ناہید نشید | تو جہاں جوی قمر مجمر کیواں ایواں
آں بہادر شہ خور جلوہ کیواں پایہ | آں بہادر شہ مہ رایت مریخ سناں

۲۵۔ صنعت تاریخ

فارسی اور اردو ادب میں تاریخ گوئی کو بہت اہمیت حاصل ہے۔ صنعت تاریخ یہ ہے کہ کوئی لفظ، فقرہ، عبارت، مصرع یا بیت ایسا تجویز کریں کہ جس کے حروف کے عددوں سے بحساب جمل سن یا سال کسی واقعہ کا نکل آئے۔ عام طور پر تاریخ ولادت، وفات، شادی، تکمیل عمارت تصنیف کتاب، فتح وغیرہ مواقع پر کہی جاتی ہے۔

غالب اپنے خطوط میں اس بات کا اعتراف کرتے ہیں کہ تاریخ گوئی سے انھیں زیادہ دلچسپی نہیں تھی اور وہ تاریخ گوئی کو شاعری کے رتبہ سے فروتر سمجھتے تھے۔ تاہم انھوں نے تاریخیں کہی ہیں

چند ایک تاریخیں دیکھئے :

تاریخ شادی (۱) ہوئی جب میرزا جعفر کی شادی — ہوا بزم طرب میں رقص ناہید
کہا غالب نے تاریخ اس کی کیا ہے — تو بولا "انشراح جشن جمشید"
۱۲۷۰ھ

تاریخ شادی (۲) خجستہ انجمن طوی میرزا جعفر — کہ جس کے دیکھے سے سب کا ہوا ہے جی محظوظ
ہوئی ہے ایسے ہی فرخندہ سال میں غالب — نہ کیوں ہو مادہ سال عیسوی "محظوظ"
۱۸۵۴ء

تاریخ وفات

(۳) جناب عالیہ از بخشش حق — بفردوس بریں چوں کرد آرام
سخن پرداز غالب سال رحلت — "خلود خلد" گفت از روی الہام
۱۲۷۴ + ۱ = ۱۲۷۵ھ

تاریخ اتمام مثنوی

(۴) چو از خامہ فکر نقش عظیم — فرو ریخت این سلک در یتیم
تماشای این عنبر آگیں بساط — بیندرد مغزم بہ عطر نشاط
بایجاد تقریب عرض نیاز — شدم فکر تاریخ را چارہ ساز
درخشید برقی زجیب خیال — کہ "کار عظیم است" تاریخ سال

۲۶ - صنعت تکرار

تکرار الفاظ سے کلام میں زور، تاثیر یا حسن پیدا کرنا صنعت تکرار ہے مثلاً

طبیعت کو ہو گا قلق چند روز
سنبھلتے سنبھلتے سنبھل جائے گی

کلام غالب سے تکرار کی مثالیں ۔

علی الرغم دشمن شہید وفا ہوں — مبارک مبارک سلامت سلامت
چپکے چپکے مجھ کو روتے دیکھ پاتا ہے اگر — ہنس کے کرتا ہے بیان شوخی گفتار دوست
منہ گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے — خوب وقت آئے تم اس عاشق بیمار کے پاس

میں بھی رک رک کے نہ مرتا جو زباں کے بدلے — دشنہ اک تیز سا ہوتا مرے غمخوار کے پاس

جہاں تیرا نقشِ قدم دیکھتے ہیں — خیاباں خیاباں ارم دیکھتے ہیں

قاصد کے آتے آتے خط اک اور لکھ رکھوں — میں جانتا ہوں جو وہ لکھیں گے جواب میں

مرتے مرتے دیکھنے کی آرزو رہ جائے گی — وائے ناکامی کہ اس کافر کا خنجر تیز ہے

ذرا کر زور سینے پر کہ تیرِ پُرستم نکلے — جو وہ نکلے تو دل نکلے جو دل نکلے تو دم نکلے

جان دی، دی ہوئی اسی کی تھی — حق تو یہ ہے کہ حق ادا نہ ہوا

کوئی ویرانی سی ویرانی ہے — دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ — اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا — روتے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

اے عندلیب یک کفِ خس بہرِ آشیاں — طوفانِ آمد آمدِ فصلِ بہار ہے

کرتا ہوں جمع پھر جگرِ لخت لخت کو — عرصہ ہوا ہے دعوتِ مژگاں کیے ہوئے

غالبِ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں — روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

صنعت تکرار کی ایک قسم متتابع ہے۔ پہلے ایک لفظ کلام میں لایا ہے۔ پھر اسی لفظ کی تکرار اس طرح سے کی جاتی ہے گویا بات سے بات پیدا کی گئی ہو مثلاً۔

ع — سہروں میں پھول دیکھے پھولوں میں خار دیکھے

کلام غالب سے مثالیں :-

تم سلامت رہو ہزار برس — ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

جاں می دہم از رشک بشمشیر چہ حاجت — سر پنجہ بہ دامن زن و دامن بکمر بر

نورِ حق است احمد و لمعان نور — از نبی در اولیاء دارد ظہور

ہر ولی پرتو پذیر است از نبی — چوں مہ از خور مستنیر است از نبی

برامید شیوۂ صبر آزمائے زیستم — تو بریدی از من و من امتحاں نامیدمش

تیرا لقا و بقا را سعادت ارزانی — مرا دعا و دعا را اثر مبارکباد

گنج سخن نہد بہ نہاں خانۂ ضمیر — وانگہ کلید گنج بدست زباں نہد

ذرہ اس گرد کا خورشید کو آئینہ ناز	گرد اس دشت کی امید کو احرام بہار
دل اسد کو ہم نے دیکھا گوشۂ غم خانہ میں	دست بر سر، سر بزانوئے دل مایوس تھا

صنعت تکرار کی ایک قسم تکرار حروف ہے جسے انگریزی زبان میں ALLITERATION کہتے ہیں اس کی چند مثالیں کلام غالب سے دیکھئے :۔

ش	شتا ہے فوت فرصت ہستی کا غم کہیں	عمر عزیز صرف عبادت ہی کیوں نہ ہو
ک	لئے جاتی ہے کہیں ایک توقع غالب	جادۂ راہ کشش کاف کرم ہے ہم کو
ک	سمجھ کے کرتے ہیں بازار میں وہ پرسش حال	کہ یہ کہے کہ سر رہگذر ہے کیا کہئے
ن	وہ نیشتر سہی پر دل میں جب اتر جائے	نگاہ ناز کو پھر کیوں نہ آشنا کیئے
س	ساز یک ذرہ نہیں فیض چمن سے بیکار	سایۂ لالہ بے داغ سویدائے بہار
ج	اے شاہ جہاں گیر جہاں بخش جہاں دار	ہے غیب سے ہر دم تجھے صد گونہ بشارت
ت	امر جدید کا تو نہیں ہے مجھے سوال	بارے قدیم قاعدے کا چاہیئے قیام
ش	شاد و دل شاد و شادماں رکھیو	اور غالب پہ مہرباں رکھیو
گ	فن صورت گری میں تیرا گرز	گر نہ رکھتا ہو دستگاہ تمام

تکرار حروف کی اور بے شمار مثالیں ہیں۔ ہم صرف انہی کو مشتے نمونہ از خروارے کے طور پر پیش کرتے ہیں

۲۷۔ صنعت تلمیح

کلام میں کسی مشہور بات، واقعہ، قصہ، شخص، چیز، آیت قرآنی وغیرہ کی طرف اشارہ کرنا فصاحت کلام کے لیے یا وضاحت کلام کے لیے تلمیح کہلاتا ہے۔

تلمیحات غالب

۱ مجنوں و لیلیٰ :۔

مانع وحشت خرامیہائے لیلیٰ کون ہے	خانۂ مجنوں صحرا گرد بے دروازہ تھا
عاشق ہوں پہ معشوق فریبی ہے مرا کام	مجنوں کو برا کہتی ہے لیلیٰ مرے آگے
جز قیس اور کوئی نہ آیا بروئے کار	صحرا مگر بہ تنگی چشم حسود تھا

قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا ۔۔۔ تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں

ب : شیریں و فرہاد

تیشے بغیر مر نہ سکا کوہکن اسدؔ ۔۔۔ سرگشتۂ خمارِ رسوم و قیود تھا

ہم سخن تیشے نے فرہاد کو شیریں سے کیا ۔۔۔ جس طرح کا بھی کسی میں ہو کمال اچھا ہے

کوہکن نقاشِ یک تمثالِ شیریں تھا اسدؔ ۔۔۔ سنگ سے سر مار کر ہووے نہ پیدا آشنا

عشق و مزدوریِ عشرت گہِ خسرو کیا خوب ۔۔۔ ہم کو تسلیم نکونامیِ فرہاد نہیں

ج : یوسف و زلیخا

یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی ۔۔۔ گر بگڑ بیٹھے تو میں لائقِ تعزیر بھی تھا

ابھی آتی ہے بو بالش سے اس کی زلفِ مشکیں کی ۔۔۔ ہماری دید کو خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے

سب رقیبوں سے ہوں ناخوش پر زنانِ مصر سے ۔۔۔ ہے زلیخا خوش کہ محوِ ماہِ کنعاں ہو گئیں

قید میں یعقوب نے لی گو نہ یوسف کی خبر ۔۔۔ لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں ہو گئیں

د : حضرت عیسیٰؑ - ابنِ مریمؑ -

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی ۔۔۔ میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی ۔۔۔ قیامت کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ہے

مر گیا صدمۂ یک جنبشِ لب سے غالبؔ ۔۔۔ ناتوانی سے حریفِ دمِ عیسیٰ نہ ہوا

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں مرے نزدیک ۔۔۔ اک بات ہے اعجازِ مسیحا مرے آگے

س : حضرت آدمؑ

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ہیں لیکن ۔۔۔ بہت بے آبرو ہو کر ترے کوچے سے ہم نکلے

نہ کھاتے گیہوں نکلتے نہ خلد سے باہر ۔۔۔ جو کھاتے حضرت آدم یہ بیسنی روٹی

س : موسیٰ طور - خلیل - نمرود -

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب ۔۔۔ آؤ نہ ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی

اگر کلیم شود ہم زباں سخن نکنیم ۔۔۔ و گر خلیل شود میہماں بگرد انیم

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ۔۔۔ بندگی میں مرا بھلا نہ ہوا۔

ص : خضر اور سکندر

کیا کیا خضر نے سکندر سے — اب کسے رہنما کرے کوئی

بے ثمر ہی گذرتی ہے ہو گرچہ عمر خضر — حضرت بھی کہیں گے کہ ہم کیا کیا کیے

وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناس خلق اے خضر — نہ تم کہ چور بنے عمر جاوداں کے لیے

ط : خاص تلمیحات :۔

ہر بن مو سے دم ذکر نہ ٹپکے خوں ناب — حمزہ کا قصہ ہوا عشق کا چرچا نہ ہوا

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا لیکن — ہم کو تقلید تنک ظرفی منصور نہیں

تھا ترنج زر ایک خسرو پاس — رنگ کا زرد پر کہاں بو باس

دے برستاخیز تارو مار قوم ناسپاس — جان اژدر در تن چوب شباں انداختہ

چھوڑا مہ نخشب کی طرح دست قضا نے — خورشید ہنوز اس کے برابر نہ ہوا تھا

چھڑکے ہے شبنم آئینۂ برگ گل پر آب — اے عندلیب وقت وداع بہار ہے

وارث ملک جانتے ہیں تجھے — ایرج و تور و خسرو و بہرام

زور بازو میں مانتے ہیں تجھے — گیو و گودرز و بیژن و رہام

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے — اب فریب طغرل و سنجر کھلا

ز معنی سے مرا صفحہ لقا کی ڈاڑھی — غم گیتی سے مرا سینہ عمر کی زنبیل

باب ششم

صنایع بدائع معنوی

۱۔ صنعت طباق یا تضاد

کلام میں ایسے دو الفاظ لانا جن کے معنی آپس میں متقابل یا متضاد ہوں۔ مثلاً آنا جانا۔ رات دن۔ صبح و شام۔ قوت و ضعف۔ سود و زیاں۔ آمد و رفت۔ اٹھنا بیٹھنا۔ نشیب و فراز۔ بلندی اور پستی وغیرہ غالب نے اس صنعت کا بہت کثرت سے استعمال کیا ہے۔ مثالیں۔

(۱) تھا خواب میں خیال کو تجھ سے معاملہ ۔۔۔ جب آنکھ کھل گئی تو زیاں تھا نہ سود تھا

(۲) بسکہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا ۔۔۔ آدمی کو بھی میسر نہیں انساں ہونا

(۳) ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ۔۔۔ نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

(۴) کم نہیں نازشِ ہمنامیٔ چشمِ خوباں ۔۔۔ تیرا بیمار بُرا کیا ہے گر اچھا نہ ہوا

(۵) نہ کہ کہ گریہ بمقدارِ حسرتِ دل ہے ۔۔۔ مری نگاہ میں ہے جمع و خرچ دریا کا

(۶) یاس و امید نے یک عربدہ میداں مانگا ۔۔۔ عجزِ ہمت نے طلسمِ دلِ سائل باندھا

(۷) دل دیا جان کے کیوں اس کو وفادار اسد — غلطی کی جو کافر کو مسلماں سمجھا

(۸) ہر روئے شش جہت در آئینہ باز ہے — یاں امتیاز ناقص و کامل نہیں رہا

(۹) نہ ہو بہرزہ بیاباں نورد وہم وجود — ہنوز تیرے تصور میں ہے نشیب و فراز

(۱۰) وہ فراق اور وہ وصال کہاں — وہ شب و روز و ماہ و سال کہاں

(۱۱) عزۂ اوج بنائے عالم امکاں نہ پوچھ — اس بلندی کے نصیبوں میں ہے پستی ایک دن

(۱۲) ہے سبزہ زار ہر در و دیوار غمکدہ — جس کی بہار یہ ہو پھر اس کی خزاں نہ پوچھ

(۱۳) کر دیا ضعف نے عاجز غالب — ننگ پیری ہے جوانی میری

(۱۴) ایک ہیں کیا کہ سب نے جان لیا — تیرا آغاز اور تیرا انجام

(۱۵) میرا اپنا جدا معاملہ ہے — اور کے لین دین سے کیا کام

(۱۶) اس قدح کا ہے دور مجھ کو نقد — چرخ نے لی ہے جس سے گردش وام

(۱۷) بوسہ دینے میں ان کو ہے انکار — دل کے لینے میں جن کو ہے ابرام

(۱۸) ہماری سادگی تھی التفات ناز پر مرنا — ترا آنا نہ تھا ظالم مگر تمہید جانے کی

(۱۹) کہوں کیا خوبی اوضاع ابنائے زماں غالب — بدی کی اس نے جس سے کی تھی ہم نے بارہا نیکی

(۲۰) بدا عتدالیوں سے سبک سب میں ہم ہوئے — جتنے زیادہ ہو گئے اتنے ہی کم ہوئے

(۲۱) جسے نصیب ہو روز سیاہ میرا سا — وہ شخص دن نہ کہے رات کو تو کیونکر ہو

(۲۲) کی اس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

(۲۳) گذرا اسد مسرت پیغام یار سے — قاصد پہ مجھ کو رشک سوال و جواب ہے

(۲۴) ہم ہیں مشتاق اور وہ بیزار — یا الٰہی یہ ماجرا کیا ہے

(۲۵) ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق — نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

(۲۶) پوچھے ہے کیا وجود و عدم اہل شوق کا — آپ اپنی آگ کے خس و خاشاک ہو گئے

(۲۷) صرف اعدا اثر شعلہ و دود دوزخ — وقف احباب گل و سنبل فردوس بریں

(۲۸) جب ازل میں رقم پذیر ہوئے — صفحہ ہائے لیالی و ایام

(۲۹) ہے ازل سے روانی آغاز — ہو ابد تک رسائی انجام

(۳۰) دل مدعی و دیدہ بنا مدعا علیہ — نظارے کا مقدمہ پھر روبکار ہے

(۳۱) ہیں اہل خرد کس روش خاص پہ نازاں — پابستگی رسم و رہ عام بہت ہے

(۳۲) تم کرد مسا جعفرانی جیب تلک — ہے طلسم روز و شب کا در کھُلا

(۳۳) اے مفیض وجود سایہ و نور — جیب تلک ہے وجود سایہ و نور

(۳۴) میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق توضیح — میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش تفصیل

(۳۵) غالب پہ کیا بیاں ہے بجز مدح بادشہ — بھاتی نہیں ہے اب مجھے کوئی نوشت خواند

(۳۶) دارم تشکر ف حالی از مرگ زیست بیردل — جاں گرچہ ہست شیریں تلخ است زندگانی

(۳۷) دانم کہ امر و نہی بود در کلام حق — سیرابی نیست ازاں آبجو مرا

(۳۸) لا تقربوا الصّلوٰۃ ز نہیم بخاطر است — وز امر یاد ماندہ کلوا واشربوا مرا

(۳۹) باز بر آنم کہ شبانہ آدرم — رُخ بنما سا کہ ناز آدرم

(۴۰) یقین عشق کن دا از سر گمان برخیز — بر آشتی بنشیں یا بہ امتحاں برخیز

(۴۱) تنم فرسود در بندہ تو بسیار — دلت بخشود بر کار من اندک

(۴۲) چوں عطای تو بود پاک ز تحریم چہ باک — مے حرام است ولی میخورم از وجہ حلال

(۴۳) دانش و گنجینہ پنداری یکیست — حق نہاں داد آنچہ پیدا خواستیم

(۴۴) در ہیچ نسخہ معنی لفظ امید نیست — فرہنگ نامہ ہائے تمنا نوشتہ ایم

(۴۵) محو گشتم در تغافل بر نتابم التفات — گر بچشم جادہ ای خواب گراں خواہم شدن

طباق یا تضاد کی دو صورتیں ہیں۔ پہلی صورت طباق ایجابی کہلاتی ہے۔ جس میں دونوں لفظ ایک دوسرے کے مقابل یا متضاد آتے ہیں۔ مثلاً حیات و ممات، آنا جانا، اٹھنا، بیٹھنا، روز و شب گرم سرد و غیرہ۔ دوسری صورت طباق سلبی کہلاتی ہے۔ اس میں دونوں لفظ ایک ہی مصدر سے مشتق ہوتے ہیں۔ اور حرف نفی سے ان میں تضاد پیدا کیا جاتا ہے مثلاً گفتن نگفتن، کشودن نکشودن اور آنا اور نہ آنا ہے اور نہ ہے۔ ہے اور نہیں ہے۔ طباق ایجابی کی مثالیں ہم اوپر درج کر چکے ہیں۔ طباق سلبی کی چند مثالیں درج ذیل ہیں۔

(۱) ہاں کھائیو مت فریب ہستی — ہر چند کہیں کہ "ہے" "نہیں ہے"

(۲) دل سے نکلا پہ نہ نکلا دل سے	ہے ترے تیر کا پیکان عزیز
(۳) ہیچ آ پڑی ہے وعدہ دلدار کی مجھے	وہ آئے یا نہ آئے پہ یاں انتظار ہے
(۴) بہ التفات تو صد گونہ اعتماد ہست	دلی شتاب کہ بر عمر اعتماد نیست
(۵) خم خم شراب عربدہ داری دگرچہ ہست	خاطر شکستن نشکستن خمار من
(۶) گزشت از دل دلی نگذشت از دل	خدنگ غمزۂ نہ دربں کمانان
(۷) گوئی بکیست پیش تو بوُد دنبود ما	با من نشستہ ای وز من سرگراں نہ ای

۲۔ صنعت ایہام

ایہام کے معنی وہم میں ڈالنا ہے۔ اس صنعت کو توریہ بھی کہتے ہیں اور توریہ کے معنی چھپانا ہے۔ اصطلاح میں اس سے یہ مراد ہے۔ کہ کلام میں ایک ایسا لفظ لایا جائے۔ جس کے دو معنی ہوں۔ ایک قریب کے اور ایک بعید کے۔ قریب سے یہ مطلب ہے۔ کہ قاری یا سامع کے ذہن میں فوراً ایک معنی متبادر ہوں۔ اور بعید کے معنوں سے یہ مراد ہے کہ وہ معنی ذرا تامل کے بعد سمجھ میں آئیں۔ ایہام قاری یا سامع کو وہم میں ڈالتا ہے۔ سامع یا قاری قریب کے معنوں کا گمان کرتا ہے اور شاعر کی مراد معنی بعید ہوتے ہیں۔ مثلاً

ع ہجر میں گھُل گھُل کے آدھا ہو گیا
لے مسیحا اب میں موسا ہو گیا

لفظ مسیحا کی رعایت سے ذہن لفظ موُسا پڑھ کر یا سن کر موسیٰ علیہ اسلام کی طرف رجوع کرتا ہے اور موُسا کے معنی بال کی مانند دبلا اور لاغر کچھ تامل کے بعد سمجھ میں آتے ہیں۔ اسی طرح

ع بلبل کو بوس ایاغ کی ہے
پروانے کو لوُ چراغ کی ہے

لفظ چراغ کی وجہ سے لوُ کے لفظ سے روشنی کا خیال آتا ہے۔ ذرا تامل کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ لفظ لوُ روشنی کے معنوں میں استعمال نہیں ہوا۔ بلکہ لگن اور محبت کے معنوں میں ہمارے بعض شاعروں

نے اس صنعت کو اس طرح استعمال کیا کہ ایک قبیح معنی کی طرف فوراً توجہ جاتی ہے۔

مثلاً سودا ؎
اے لالچی تو کیسہ غیر دں کا کیوں ٹوٹے
جو چاہتا ہے یک شب مجھ پاس آکے سوئے

"سوئے" میں ایہام ہے۔ قریب کے معنی ظاہر ہیں، کہ میرے ساتھ ایک رات سوئے۔ لیکن بعید کے معنی جو شاعر کی مراد ہے، یہ ہیں کہ جو کچھ چاہتا ہے۔ سو کسی رات آکر مجھ سے لے لے۔

اسی وجہ سے ایہام بدنام ہوا یہی سبب ہے، کہ ایہام گوئی سے شاعر بیزاری اور نفرت کا اظہار کرتے چلے آئے ہیں۔ سودا ایہام گوئی سے نفرت کا یوں اظہار کرتے ہیں:

؎ یک رنگ ہوں آتی نہیں خوش مجھ کو دو رنگی
منکر سخن و شعر میں ایہام کا میں ہوں

لیکن باوجود اس اعلان کے ان کے کلام میں صنعت ایہام موجود ہے۔ غالب کے کلام میں بھی ایہام کی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ لیکن اُن کے ایہام میں کوئی قباحت نہیں۔ بلکہ ایہام سے شعر پر لطف ہو جاتا ہے۔ چند مثالیں دیکھیے:۔ (خط کشیدہ الفاظ میں ایہام ہے۔

(۱) محرم نہیں ہے تو ہی نواہائے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(۲) ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت کچھ نہ پوچھ
ہے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

(۳) غم سے مرتا ہوں کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیت مہر و وفا میرے بعد

(۴) تھا زندگی میں مرگ کا کھٹکا لگا ہوا
اڑنے سے پیشتر بھی مرا رنگ زرد تھا

(۵) زبان اہل زباں میں ہے مرگ خاموشی
یہ بات بزم میں روشن ہوئی زبانی شمع

(۶) آتا ہے میرے قتل کو پر جوشِ رشک سے
مرتا ہوں اُس کے ہاتھ میں تلوار دیکھ کر

(۷) کیا کہوں تاریکیِ زندانِ غم اندھیر ہے
پنبہ نورِ صبح سے کم جس کے روزن میں نہیں

(۸) آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تیری زلف کے سر ہونے تک

(۹) جذبۂ بے اختیار شوق دیکھا چاہیے
سینۂ شمشیر سے باہر ہے دم شمشیر کا (دم سانس اور تلوار کی دھار)

(۱۰) موجِ سرابِ دشتِ وفا کا نہ پوچھ حال
ہر ذرہ مثلِ جوہرِ تیغ آب دار تھا

(۱۱) جلے ہے دیکھ کے بالینِ یار پر مجھ کو
نہ کیوں ہو دل پہ مرے داغِ بدگمانیِ شمع

(۱۲) ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پاؤں میں در و دیوار

(۱۳) گرچہ ہے طرزِ تغافل پردہ دارِ رازِ عشق
پر ہم ایسے کھوئے جاتے ہیں کہ وہ پا جائے ہے

(۱۴) دل میں پھر گریہ نے اک شور مچایا غالبؔ
آہ جو قطرہ نہ نکلا تھا سو طوفان نکلا (نکلا۔ باہر آیا اور نکلا ثابت ہوا)

(۱۵) دل آپ کا کہ دل میں ہے جو کچھ سو آپ کا
دل لیجئے مگر میرے ارمان نکال کے

(۱۶) چوں نیست تاب برقِ تجلی کلیم را
کے در سخن بہ غالبِ آتش بیاں رسد

(۱۷) غالب چوں شخص و عکس در آئینہ خیال
با خویشتن یکی و دو چار خودیم ما

(۱۸) عالم ترفیق را غالب سواد اعظم
ہر چند رپیشہ دارم حیدر آباد خودم

۳۔ صنعت ایہام تضاد

کلام میں دو لفظ ایسے لانا کہ جن میں باہم تقابل و تضاد نہ ہو۔ لیکن ان کو ایسے الفاظ کے ساتھ بیان کرنا کہ جن میں باہم تقابل و تضاد پایا جاتا ہے اور اس طرح سے یوں محسوس ہے کہ اضداد کا بیان کیا جا رہا ہے۔ مثلاً

بن ترے بہر چمن کو نہ گئے ہم ورنہ
خندۂ گل نے ہمیں خوب رُلایا ہوتا

پھول کے کھلنے اور آدمی کے رونے میں کوئی تقابل و تضاد نہیں لیکن جب پھول کے کھلنے کو خندہ گل کہا گیا۔ تو رونے سے تضاد پیدا ہو گیا۔

کلام غالب سے ایہام تضاد کی مثالیں :۔

(۱) کبھی شکایت رنج گراں نشیں کیجے
کبھی حکایات صبر گریز پا کہیے

رنج اور صبر میں تضاد نہیں ہے۔ تضاد رنج اور راحت میں ہے۔ لیکن رنج کو گراں نشیں اور صبر کو گریز پا قرار دینے سے ان میں تضاد واقع ہو گیا اور معنوں میں ایک خاص لطف پیدا ہو گیا۔

(۲) سوزش باطن کے ہیں احباب منکر ورنہ یاں
دل محیط گریہ اور لب آشنائے خندہ ہے

دل اور لب میں تضاد نہیں ہے۔ لیکن گریہ اور خندہ میں تضاد ہے۔ اس لیے دل کو گریہ کے ساتھ اور لب کو خندہ کے ساتھ نسبت دینے سے تضاد پیدا ہو گیا۔

دہن و چشم و دست و دل ہمہ تنگ

(۱۶) خشک است کشت شیوۂ نخریر رفتگاں
سیرابش از نم رگ ابر قلم کنم

(۱۷) سایہ و چشمہ بصحرا دم عیشی دارد
اگر اندیشۂ منزل نبود رہزن ما

(۱۸) زیں ساں کہ سربسر گل و ریحان و سنبل است
طرف چمن نمونۂ طرف کلاہ کیست

(۱۹) افتادگی نمانہ دل ناتوان ماست
در دسر قیام و قعودش نماندہ است

(۲۰) ہوا مخالف و شب تار و بحر طوفاں خیز
گسستہ لنگر کشتی و ناخدا خفتست

(۲۱) دلم بہ سبحہ و سجادہ و ردا لرزد
کہ دزد مرحلہ بیدار و پارسا خفتست

(۲۲) با دوست ہر کہ بادہ بخلوت خورد مدام
داند کہ حور و کوثر و دار السلام چیست

(۲۳) نشادم ببزم وعظ کہ رامش اگرچہ نیست
باری حدیث چنگ و نی و عود می رود

(۲۴) گیرم اے بخت ہدف نیستم آخر گاہے
غلط انداز خدنگے ز کمانے بمن آر

(۲۵) رقمی از معشوق ہر جا در کتابی بنگری
بر کنار آں ورق جانبِ خدا بنش می نویس

(۲۶) ای کہ با یارم خرامی گرد دل دوستیت ہست
نام من در رہگذر بر خاک پایش می نویس

۵۔ صنعت سوال و جواب

کلام میں سوال و جواب کا لانا۔ یہ صنعت کبھی ایک مصرعہ میں کبھی ایک شعر میں کبھی زیادہ اشعار میں پیدا ہوتی ہے۔ شعر میں پہلے کسی ایک چیز کے متعلق سوال کیا جاتا ہے۔ اور پھر وہ چیز اس کا جواب دیتی ہے۔ مثلاً ؎

اس سے جب پوچھا کہ تو نے قتل عاشق کر کیا؛
غمزہ بولا۔ وہ نزاکت تھی ادا تھی۔ میں نہ تھا (…رامپوری)

یا

رخ نے تیرے زلف سے کہا شب کو
تو شب [illegible] ہے سحر میں ہوں
زلف بولی کہ [illegible] تو ہیں [illegible]
بیچ میں تو ادھر ادھر میں ہوں (ظفر)

غالب کے اردو کلام میں صرف دو تین اشعار میں یہ صنعت پائی جاتی ہے مگر فارسی کلام میں اس کی کئی مثالیں ہیں۔

اردو کے ایک قصیدہ میں شاعر مہ نو سے سوال کرتا ہے۔ کہ تو دو دن کہاں غائب رہا۔ مہ نو جواب دیتا ہے۔ کہ بندہ عاجز ہے اور گردش ایام کی وجہ سے دو دن نظر نہیں آیا۔ یہ سوال و جواب ایک ہی شعر میں ہے:۔

بارے دو دن کہاں رہا غائب؟
"بندہ عاجز ہے، گردش ایام"

کلیات غالب (فارسی) میں قطعہ نمبر ۱ تقریباً سارا صنعت سوال و جواب میں لکھا گیا ہے۔ شاعر ساقی سے بعض امور کے متعلق سوال کرتا ہے۔ اور ساقی جواب دیتا ہے۔

(۱) گفتم ای محرم سرائے سرور — از ادب دور نیست پرسیدن
(۲) اول از دعوے وجود بگو — گفت کفر است در طریقت من

(۳) گفتم آخر نمود اشیا چیست — گفت بی بی نمی تواں گفتن

(۴) گفتمش با مخالفاں چکنم — گفت طرح بنائے صلح فگن

(۵) گفتم ایں حب جاہ و منصب چیست — گفت دام فریب اہرمن

(۶) گفتمش چیست منشاء سفرم — گفت جور و جفای اہل وطن

(۷) گفتم اکنوں بگو کہ دہلی چیست — گفت جان است و ایں جہانش تن

(۸) گفتمش چیست ایں بنارس گفت — شاہدی مست محو گل چیدن

(۹) گفتمش چوں بود عظیم آباد — گفت رنگین تر از فضای چمن

(۱۰) گفتمش سلسبیل خوش باشد — گفت خوشتر نباشد از سوہن

(۱۱) حال کلکتہ باز جستم گفت — باید اقلیم ہشتمش گفتن

(۱۲) گفتم آدم بہم رسد دروے — گفت از ہر دیار و از ہر فن

(۱۳) گفتم ایں جا چہ شغل سود دہد — گفت از ہر کہ ہست ترسیدن

(۱۴) گفتم اینجا چہ کار باید کرد — گفت قطع نظر ز شعر و سخن

(۱۵) گفتم ایں ماہ پیکراں چہ کس اند — گفت خوبان کشور لندن

(۱۶) گفتم ایشاں مگر دلی دارند — گفت دارند لیکن از آہن

(۱۷) گفتم از بہر داد آمدہ ام — گفت بگریز و سر بسنگ مزن

(۱۸) گفتم اکنوں مرا چہ زیبد گفت — آتش بر دو عالم افشاندن

(۱۹) گفتمش باز گو طریق نجات — گفت غالب بکہ بلا رفتن

انیسویں قصیدے میں بھی اسی طرح کی تمہید سے عقل فعال کی محفل میں پہنچ کر سوال وجواب کی
کی طرح یوں ڈالتے ہیں۔

(۱) دوشش در عالم معنی کہ ز صورت بالاست
عقل فعال سراپردہ ز دو بزم آراست

(۲) خواند از دیدہ وری دیدہ وراں را بہ بساط
تا بہ بینند کہ اسرار نہانی پیدا است

اور پھر چند اشعار کے بعد کہتے ہیں :۔

(۳) گفتم اسرار نہانی ز تو پرسش دارم
گفت جز محرمیِ ذات کہ بیچون دچراست

(۴) گفتم از کثرت و وحدت سخنی گوی برمز
گفت موج و کف و گرداب ہمانا دریاست

(۵) گفتم آیا چہ بود کشمکش ردّ و قبول
گفت آہ از سر این رشتہ کہ در دست قضاست

(۶) گفتمش ذرہ بخورشید رسد گفت محال
گفتمش کوشش من در طلبش گفت رواست

(۷) گفتم آں خسرو خوباں بسخن گوش بند
گفت گر گوش بند زہرۂ گفتار کراست

(۸) گفتم از بالش پر چارہ ندارد سر من
گفت ہر سر کہ چنین است سزائے سرپاست

(۹) گفتم از اہل فنا گر خبری ہست بگوی
گفت ایں قافلہ بے گرد و و بانگ دراست

(۱۰) گفتم از داغ چہ خیزد کہ بہ بندم بر دل
گفت چوں درد گرانپای شود داغ دواست

(۱۱) گفتم افسوس کہ کمتر دیدم داد سپہر
گفت خاموش کہ در دادنکنجد کم وکاست

(۱۲) گفتم آں بیت کہ ہموارہ سرائی از کیست
گفت غالب کہ ہم از غالب آشفتہ نواست

قصیدہ سی و ہشتم در مدح ٹامس ماڈک میں بھی سوال و جواب میں مدح کے کچھ اشعار دیکھیے۔

(۱) گفتم ایں چیست کہ ما ماہ منیرش نامیم گفت جا و تو کہ ایں شمسۂ ایوان منست

(۲) گفتم ایں چیست کہ ما جوشِ بہارش گوئیم — گفت فیضِ تو کہ آں موجۂ طوفان مست

(۳) گفتم ایں چرخ کہ گردد گُذرش بر چہ خطاست — قلمت گفت سرش بر خطِ فرمان منست

(۴) گفتم ایں ابر کہ باردیزش از چہ رہست — کرمت گفت رہش بر درِ عمان منست

(۵) ذرہ کردہ ست را بہوا در پرداز — بچرخ ہفتم بہ فہم گفت کہ کیوان منست

---

۶ - تاکید المدح بمایشبہ الذم

کلام میں کسی کی مدح اس انداز سے کرنا کہ اس پہ ذم کا شک پڑے۔ لیکن پورا کلام سننے یا پڑھنے کے بعد معلوم ہو کہ ازدیادِ مدح کے لئے یہ انداز ملحوظ رکھا گیا ہے۔

مثلاً غالب ؎

چاہا تھا میں نے تم کو مہِ چاردہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال خام
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عزّ و جاہ رہے گا علی الدوام

---

۷ - تاکید الذم بمایشبہ المدح

کلام میں کسی کی مذمت اس انداز سے کرنا کہ اس پہ مدح کا دھوکا ہو۔

غالب نے کلکتہ کے بحث و مباحثہ کے بعد ایک مثنوی فارسی میں لکھی۔ جو "بادِ مخالف" کے نام سے کلیاتِ فارسی میں موجود ہے۔ بحث "ہمہ عالم" کے استعمال کی صحت یا عدمِ صحت سے تھی۔ فریقِ مخالف نے قتیل کی سند پیش کی۔ قتیل ایک تو ہندوستانی اور پھر کھتری قوم کا ایک فرد۔ غالب نے اس کی سند کے پرزے اڑا دئے۔ اور ایرانی شاعروں کے حوالے دئے۔ قصہ مختصر اُس مثنوی میں غالب نے قتیل کی ہجو ملیح کی ہے اور ہجو ملیح "تاکید الذم بما یشبہ المدح" کا ہی نام ہے۔ اس مثنوی کے کچھ اشعار درج ذیل ہیں۔ آخری اشعار مدح معلوم ہوتے ہیں۔ لیکن ان پر غور کریں تو ذم کا

بہلو صاف عیاں ہے

(۱)	کایں زباں خاص اہل ایرانست	مشکل ما و سہل ایرانست
(۲)	سخن ماست آشکار و نہاں نیست	دہلی و لکھنؤ ز ایراں نیست
(۳)	دوستاں را اگر زمن گلہ است	نہ قرارست خلاف [illegible]
(۴)	میروم از پئے تقتیل ہمہ	ساختہ [illegible]
(۵)	مرحبا سازِ خوشش بیانی مرد	[illegible]
(۶)	نثر او نقش بال طاؤس است	[illegible] است
(۷)	پادشاہی کہ در قلمرو حرف	[illegible] ہائے شگرف
(۸)	خامہ ہندوی پارسی دانش	[illegible] فرمانش

۸۔ صنعتِ اطراد

کلام میں ممدوح کے باپ دادا کا نام بھی لانا اطراد کہلاتا ہے۔ مثلاً دبیر ؎

یہ رتبہ مظلوم حسین ابن علی ہے
مدّاح کا مدّاح خدائے ازلی ہے

کلام غالب سے مثالیں :۔

(۱) ہی کاتب تقدیر کہ در زمرۂ احیاء
چوں نام حسین ابن علی رفت قلم زد (قطعہ نمبر ۶۶)

(۲) گشت داغ غم حسین علیؓ
تازہ در ماتم حسین علیؓ

(۳) وردمن بود غالب یا علی ابوطالب
نیست بحل باطالب اسم اعظم ازمن پرس (غزلیات)

(۴) نہ چھوڑی حضرت یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر (دیوان اردو)

(۵) خوابش بشبستان حسین ابن علیؑ نیں
دریاب بہ پہلوی ہم آرامش ہم را (قصیدۂ یازدہم)

(۶) فروغ جوہر ایماں حسین ابن علیؑ
کہ شمع انجمن کبریا کہیں اس کو (سلام دیوان اردو)

(۷) چہ دنداں در جگر افشردہ باشی کاندراں وادی
حسین ابن علیؑ را در شمار کشتگاں بینی (قصیدہ ۵۳)

ق (۸) سپہر سفلہ نجا کم فگند د می بینی چگونہ پوست ہمی از تن نزار کشد (قصیدہ ۵۱)

(۹) گہم چو یوسف یعقوب درچہ اندازد گہی چوں عیسیٰ مریم فراز دار کشد

۹۔ صنعت تجرید

ایک ذی صفت شے سے اُسی طرح کی ایک اور ذی صفت شے حاصل کرنا۔ یا کسی چیز کی یوں تعریف کرنا کہ ایک مدح سے دوسری مدح حاصل ہو۔ (تجرید پر تشبیہ کا دھوکہ ہوتا ہے۔ مگر دونوں میں فرق ہے۔

مثلاً ؎

چہرۂ انور سے تیرے ماہ کامل آشکار
اور گیسوئے معنبر سے شب یلدا عیاں

یہ تجرید ہے۔ تشبیہ یوں ہوتی۔ کہ تیرا چہرۂ انور ماہ کامل کی مانند ہے اور تیرے گیسوئے معنبر شب تاریک کی طرح سیاہ ہیں۔

کلام غالب سے مثالیں:۔

(۱) بسنہ نہ کھلنے پر یہ عالم ہے کہ دیکھا ہی نہیں
زلف سے بڑھ کر نقاب اُس شوخ کے منہ پر کھلا

(۲) واقعی دل پہ بھلا لگتا تھا داغ
زخم لیکن داغ سے بہتر کھلا

(۳) جس بزم میں کہ ہو انہیں آئین یکشی
واں آسمان شیشہ بنے آفتاب جام

(۴) سچ ہے تم آفتاب ہو جس کے فروغ سے
دریائے نور ہے فلک آبگینہ فام

(۵) بود غالب عندلیبے از گلستان عجم
من ز غفلت طوطی ہندوستاں نامیدش

(۶) جم پایہ بو ظفر کہ بمیزان اعتبار | اورنگ دی بہ تخت سلیماں برابرست

(۷) در مدح شاہ معرف شاہم بہ معرفت | باشبلی و جنید بعرفاں برابرست

(۸) ہم پادشاہ عالم و ہم غوث اعظمی | دار الخلافہ از تو بہ گیلاں برابرست

(۹) رخش تو سپاہی بہارست در خرام | گردش بہ سنبل پیچاں برابرست

۱۰۔ صنعتِ محتمل الضدین

کلام میں ایسے الفاظ لانا جن کے معانی میں دو وجہ مختلف کا احتمال ہو اور وہ دونوں وجہیں باہم تضاد کا علاقہ رکھتی ہوں اور اس وجہ سے کلام کے دو معنی لیے جا سکتے ہوں۔ مثلاً

(۱) ؎ یوسف اس کو کہوں اور کچھ نہ کہے خیر ہوئی
گر بگڑ بیٹھے تو میں لائق تعزیر بھی تھا

ایک معنی تو یہ ہیں۔ کہ میں اُسے یوسف کہوں۔ تو ڈر ہے۔ کہ کہیں بگڑ نہ بیٹھے۔ اور یہ نہ کہے کہ کہاں حضرت یوسف جو حُسن میں بے نظیر تھے اور کہاں میں معمولی شکل و صورت کا عام انسان، اور دوسرے یہ کہ اُسے اپنے حسن پر اس قدر حسنِ ظن ہے کہ میری اس تشبیہہ پر بگڑ جاتا اور عتاب آلود لہجے میں کہتا کہ مجھے یوسف کے مانند قرار دینا میری بے عزتی ہے۔ اور یہ دونو معنی آپس میں

تضاد کا علاقہ رکھتے ہیں۔

(۲) ہے ہے خدا نخواستہ وہ اور دشمنی
اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا خیال ہے

ایک معنی تو یہ ہیں۔ کہ وہ اور اُس سے دشمنی کی جائے۔ کس قدر قابلِ افسوس بات ہے دوسرے معنی یہ کہ وہ اور ہم سے دشمنی کرے۔ نہیں ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ اے شوقِ منفعل یہ تجھے کیا ہو گیا ہے۔ ان دونوں معنوں میں بھی تضاد کا علاقہ ہے۔

(۳) آج ہم اپنی پریشانی کی خاطر ان سے
کہنے جاتے تو ہیں پر دیکھئے کیا کہتے ہیں

"دیکھئے کیا کہتے ہیں" میں احتمال ضدین ہے۔ دیکھئے۔ ہمارے منہ سے کیا نکلتا ہے یا دیکھئے ہماری پریشانی خاطر کا حال سن کر وہ کیا کہتے ہیں۔

(۴) سر اڑانے کے جو وعدہ کو مکرر چاہا
ہنس کے بولے کہ ترے سر کی قسم ہے ہم کو

"ترے سر کی قسم ہے ہم کو" اس جملہ کے دو متضاد معنی ہیں۔ ایک یہ کہ تیرے سر کی قسم ہم ضرور سر اڑائیں گے اور دوسرے یہ کہ ہم کو تیرے سر کی قسم ہے۔ یعنی ہم تیرا سر کبھی نہ اڑائیں گے۔

(۵) کوئی ویرانی سی ویرانی ہے
دشت کو دیکھ کے گھر یاد آیا

جہاں اس کے یہ معنی ہیں کہ دشت اس قدر ویران ہے کہ اس کی ویرانی کے خوف سے گھر کی آبادی اور آرام یاد آتا ہے۔ وہیں اس کے یہ معنی بھی ہو سکتے ہیں کہ گھر بھی اس قدر ویران ہے۔ کہ دشت کی ویرانی دیکھ کر گھر کی ویرانی یاد آتی ہے۔ لہٰذا ان دونوں معنوں میں تضاد ہے۔

۱۱۔ صنعتِ تجاہلِ عارفانہ

کسی چیز کی نسبت باوجود علم کے نہ جاننے کا اظہار کرنا تجاہلِ عارفانہ کہلاتا ہے۔ شعر میں اس سے عام

طور پہ تعریف میں مبالغہ مقصود ہوتا ہے مثلاً

(۱) نصرت الملک بہادر مجھے بتلا کہ مجھے
تجھ سے جو اتنی ارادت ہے تو کس بات سے ہے

(۲) خامہ انگشت بدنداں کہ اسے کیا لکھئے
ناطقہ سر بگریباں کہ اسے کیا کہئے

(۳) کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا
ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام

(۴) زباں پہ بار خدایا یہ کس کا نام آیا
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کیلئے

۱۲۔ صنعتِ لف و نشر

کلام میں پہلے چند چیزوں کا ذکر کرنا اور پھر اُن کے مناسبات کا ترتیب سے یا بغیر ترتیب کے ذکر کرنا۔ اور مناسبات ترتیب سے مذکور ہوں۔ تو لف و نشر مرتب کہلائے گا ورنہ لف و نشر غیر مرتب۔

کلام غالب سے مثالیں:

(۱) آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضعِ سوز و نم و رم و آرام — لف و نشر مرتب

(۲) لطف خرام ساقی و ذوق صدائے چنگ
یہ جنت نگاہ وہ فردوس گوش ہے — لف و نشر مرتب

(۳) رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند
برق کو دے رہا ہے کیا الزام
تیرے فیل گراں جسد کی صدا
تیرے رخش سبک عناں کا خرام — لف و نشر مرتب

(۴) تو آب سے گر سلب کرے طاقت سیلاں — تو آگ سے گر دفع کرے تاب شرارت
ڈھونڈے نہ ملے موجۂ دریا میں روانی — باقی نہ رہے آتش سوزاں میں حرارت

۱۳ - صنعتِ جمع

کلام میں چند چیزوں کا ایک ہی حکم یا شرط یا قید کے تحت جمع کرنا۔ مثلاً

(۱) بوئے گل، نالۂ دل، دودِ چراغ محفل
جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

وہ حکم یا قید جس کے تحت بوئے گل، نالۂ دل اور دودِ چراغ محفل جمع کئے گئے ہیں یہ ہے۔ کہ جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا۔

(۲) بلائے جاں ہے غالب اس کی ہر بات
عبارت کیا، اشارت کیا، ادا کیا

(۳) اک تیر ہے کہ جس میں دو نو چھدے پڑے ہیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا

(۴) جب میکدہ چھٹا تو پھر اب کیا جگہ کی قید
مسجد ہو مدرسہ ہو کوئی خانقاہ ہو

یعنی میکدہ کے بعد مسجد، مدرسہ، خانقاہ سب ایک جیسی جگہیں ہیں۔ کہیں بیٹھ کر شغل مے نوش کریں مسجد مدرسہ خانقاہ سب برابر ہیں۔

(۵) ربطِ یک شیرازۂ وحشت ہیں اجزائے بہار
سبزہ بیگانہ، صبا آوارہ، گل ناآشنا

(۶) ایک ہنگامے پہ موقوف ہے گھر کی رونق
نوحۂ غم ہی سہی نغمۂ شادی نہ سہی

(۷) تیرے پرتوے ہوں نشو و نما پذیر
کو و مشکوی و صحن و منظر و بام

(۸) خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار
بارے نوکر بھی ہو گیا صد شکر
نسبتیں ہو گئیں مشخص چار

۴۱۔ صنعت تفریق

کلام میں ایک نوع کی دو چیزوں میں فرق ظاہر کرنا۔ مثلاً

ے تجھ کو مسجد ہے مجھ کو میخانہ
واعظا اپنی اپنی قسمت ہے

کلام غالب سے مثالیں

(۱) تو اور آرائش خم کاکل
میں اور اندیشہ ہائے دور دراز

(۲) میں اور صد ہزار نوائے جگر خراش
تو اور ایک وہ نہ شنیدن کہ کیا کہوں

ابوالقاسم خاں قاسم اور مرزا احمد بیگ طپاں سے غالب کی کلکتہ کے سفر کے دوران میں ملاقات ہوئی تھی۔ غالب نے دونوں کے متعلق صنعت تفریق میں ایک غزل لکھی۔ جو درج ذیل ہے۔

(۱) دیکھنے میں گرچہ دو پر ہیں یہ دونو یار ایک
وضع میں گر ہوئی دو سر تیغ ہے ذوالفقار ایک

(۲) ہم سخن اور ہم زباں حضرت قاسم و طپاں
ایک طپش کا جانشیں درد کا یادگار ایک

(۳) نقدِ سخن کے واسطے ایک عیارِ آگہی
شعر کے فن کے واسطے مایۂ اعتبار ایک

(۴) ایک وفا دہر میں نازگیِ بساطِ دہر
لطف و کرم کے باب میں زینتِ روزگار ایک

(۵) گلکدۂ تلاش کو ایک ہے رنگ ایک بو
ریختہ کے قماش کو پود ہے ایک تار ایک

(۶) مملکتِ کمال میں ایک امیرِ نامور
عرصۂ قیل و قال میں خسروِ نامدار ایک

(۷) گلشنِ اتفاق میں ایک بہارِ بے خزاں
میکدۂ وفاق میں بادۂ بے خمار ایک

(۸) زندۂ شوقِ شعر کو ایک چراغِ انجمن
کشتۂ ذوقِ شعر کو شمعِ سرِ مزار ایک

(۹) دونوں کے دل حق آشنا دونوں رسول پر فدا
ایک محبِ چار یار عاشقِ ہشت و چار ایک

(۱۰) جانِ وفا پرست کو ایک شمیمِ نوبہار
فرقِ ستیزہ مست کو ابرِ تگرگ بار ایک

(۱۱) لایا ہے کہہ کے یہ غزل شائبۂ ریا سے دور
کرکے دل و زبان کو غالبؔ خاکسار ایک

۱۵- صنعتِ تقسیم

کلام میں چند چیزوں کا ذکر کرکے ہر ایک کو اُن کے منسوبات پر بقید تعیین کے تقسیم کرنا، یا کسی شے کے احوال بیان کرنا، اور ہر حال کی طرف ایک ایسی بات جو اس کے مناسب ہو مضاف کرنا

مثلاً

قسمت کیا ہر ایک کو قسام ازل نے
جو شخص کہ جس چیز کے قابل نظر آیا
بلبل کو دیا نالہ تو پروانے کو جلنا
غم ہم کو دیا سب سے جو مشکل نظر آیا

غالب کے ایک قصیدہ کے آخری شعروں میں اس صنعت کو دیکھئے۔

(۱) جب ازل میں رقم پذیر ہوئے
صفحہ ہائے لیالی و ایام

(۲) اور اُن اوراق میں بہ کلک قضا
مجملاً مندرج ہوئے احکام

(۳) لکھ دیا شاہدوں کو عاشق کش
لکھ دیا عاشقوں کو دُشمن کام

(۴) آسمان کو کہا گیا کہ کہیں
گنبدِ تیز گردِ نیلی فام

(۵) حکم ناطق لکھا گیا کہ لکھیں
خال کو دانہ اور زلف کو دام

(۶) آتش و آب و باد و خاک نے لی
وضع سوز و نم و رم و آرام

(۷) مہرِ رخشاں کا نام خسرو روز
ماہِ تاباں کا اسم شحنہ شام

(۸) تیری توقیع سلطنت کو بھی
دی بدستور صورتِ ارقام

(۹) کاتبِ حکم نے بموجب حکم
اس رقم کو دیا طرازِ دوام

(۱۰) ہے ازل سے روائی آغاز

ہو ابد تک رسائی انجام

۱۶۔ صنعت جمع و تفریق و تقسیم

کلام میں چند چیزوں کو کسی حکم کے تحت جمع کرنا صنعت جمع ہے اور پھر ان چیزوں کے متعلق ایسی بات لکھنا جس سے ان میں امتیاز کیا جا سکے۔ صنعت تفریق ہے اور پھر ہر حال کے مناسبات بیان کرنا تقسیم ہے صنعت جمع کے ساتھ عموماً تفریق یا تقسیم کی صنعت بھی پائی جاتی ہے اور بعض دفعہ کلام میں یہ تینوں صنائع بدائع اکٹھے آتے ہیں۔ درج ذیل مثالوں پر غور کیجیے۔

(ا) صنعت جمع

بوئے گل، نالہ دل، دود چراغ محفل

جو تری بزم سے نکلا سو پریشاں نکلا

(ب) صنعت جمع و تفریق سے

فیض سے تیرے ہے اے شمع شبستان بہار

دل پروانہ چراغاں، پر بلبل گلنار

یا۔ کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے بہشت

یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

(ج) صنعت جمع و تقسیم سے

دانم کہ امر و نہی بود در کلام حق

سیرابی نیست ازاں آبجو مرا

لَا تَقْرَبُوا الصَّلٰوۃَ زنہیم بخاطر است

وز امر یاد ماندہ کُلُوا وَاشْرَبُوا مرا

(د) صنعت جمع و تفریق و تقسیم سے

بآدم زن، بشیطاں طوق لعنت

سپردند از رہ تکریم و تذلیل

ولیکن در اسیری طوق آدم

گراں تر آمد از طوق عزازیل

یا

تکیہ بر عالم دعا بذ تواں کرد کہ ہست
آں یکی بیہدہ گوئی واین دگری بیہدہ کوش
نیست جز حرف دراں فرقہ اندر زسرای
نیست جز رنگ دریں طائفہ ازرق پوش

۱۷۔ صنعتِ رجوع

کلام میں ایک شے کی کوئی صفت بیان کرنا اور پھر اس صفت کو باطل ٹھہرا کر کسی دوسری صفت کی طرف جو پہلی صفت سے بہتر ہو، رجوع کرنا۔ مثلاً

؎ خنجر تھا الٰہی یا زباں تھی
خنجر سے زیادہ تر رواں تھی (مومن)

کلام غالب سے صنعت رجوع کی مثالیں :-

(۱) چاہا تھا میں نے تم کو مہ چار دہ کہوں
دل نے کہا کہ یہ بھی ہے تیرا خیال خام
دو رات میں تمام ہے ہنگامہ ماہ کا
حضرت کا عز و جاہ رہے گا علی الدوام

(۲) چوں لعل تست غنچہ اما سخن ندارد
چوں چشم تست نرگس اما حیا ندارد

(۳) در بذل و عدل حاتم و کسری مسلم اند
پیش از تو بودہ این دو ز پس روانِ تو
نی نی ز بذل و عدل چگویم ازانکہ ہست
این ہر دو صفحہ یک ورق از داستان تو (قصیدہ ۴۳ در مدح لارڈ ایلن برا)

۱۸۔ صنعتِ حسن التعلیل

کسی چیز کی صفت کے لئے ایک ایسی چیز کو اُس کی علت ٹھہرانا جو دراصل اس کی علت نہ ہو۔ مگر شاعر کی بیان کی ہوئی علت بھی ممکن ہو۔ اس صنعت میں تمام اردو اور فارسی کے شاعروں نے شعر کہے ہیں، مگر غالب نے اس میں وہ کمال دکھایا ہے کہ باید وشاید۔

ابلیس لعین نے آدم کو سجدہ نہ کیا۔ اس کے لئے علماء اور فقہا نے کئی وجوہات بتائے ہیں، لیکن غالب نے جو علت بیان کی ہے۔ وہ یہ کہ ابلیس کو نظر آگیا تھا۔ کہ اس آدم کی اولاد میں سے ایک ایسا نالائق اور ذلیل انسان پیدا ہوگا۔ جو غالب کا حریف ہوگا۔ اور اوچھے وار کرکے اپنی کم ظرفی اور دون ہمتی کا اظہار کرے گا۔ اس لئے ایسی ہستی کے جدامجد (ابوالبشر) کو سجدہ کرنے سے انکار کردیا۔

ہمچو تو نا قابلی در صلب آدم دیدہ بُود

زاں سبب ابلیس ملعوں سجدہ برآدم نکرد (قطعہ ۱۷)

مٹی کے پیالے کو جام جم سے افضل اور بہتر قرار دینے کے لئے کہا

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

جام جم سے یہ مرا جام سفال اچھا ہے

حسن التعلیل کی صنعت میں اور اشعار دیکھئے۔

(۱) ہر مہینے میں جو یہ بدر سے ہوتا ہے ہلال — آستانہ پہ ترے ناصیہ سا ہوتا ہے

(۲) دیا ہے خلق کو بھی تا اُسے نظر نہ لگے — بنا ہے عیش تجمل حسین خاں کے لئے

(۳) مے ہی پھر کیوں نہ میں پیئے جاؤں — غم سے جب زیست ہوگئی ہے حرام

(۴) کی اُس نے گرم سینۂ اہل ہوس میں جا — آوے نہ کیوں پسند کہ ٹھنڈا مکان ہے

(۵) زنہار از تعب دوزخ جاوید مترس — خوش بہاریست کزو بیم خزاں برخیزد

(۶) بزمست بہشت و بادہ حلال است در بہشت — گر بازپرس رُود بدازمن جواب خواہ

(۷) طوطیاں را نبود سبزہ جگر خوں منقار — خوردہ خون جگر از رشک سخن گفتن ما

(۸) بُستانیاں بجاتم شہزادہ بیخودند — زیں رُو بود کہ پیرہن گل دریدہ ماند

۱۹۔ صنعتِ مشاکلہ

یعنی کلام میں دو چیزوں کا ذکر کرنا اور ان دونوں کو ایک جگہ مذکور ہونے کی مناسبت سے ایک ہی لفظ سے تعبیر کرنا۔ مثلاً ؎ خط مجھے لشکر سے بھیجا یار نے فوجِ غم پر آج دل فیروز ہے

لشکر کی مناسبت سے غم کو بھی فوج کے ساتھ تعبیر کیا ہے۔

یا ؎ کیا کہوں احباب کی آہن دلی پاؤں میں فولاد کی زنجیر ہے

فولاد کی زنجیر کی مناسبت سے احباب کی سرد مہری کو آہن دلی سے تعبیر کیا ہے۔

کلامِ غالبؔ سے مثالیں :۔

(۱) نغمہ ہائے غم کو بھی اے دل غنیمت جانیے
بے صدا ہو جائے گا یہ سازِ ہستی ایک دن

سازِ ہستی کی مناسبت سے غم کو نغمہ کہا ہے۔

(۲) تا بستیزِ دہار تیغ ز آتش کشید
تا بگریزِ خزاں پو بیہ ز صرصر گرفت
سکہ بآتش سپرد نامیہ سیمائے گُل
اُمتِ گل فوج فوج کیشِ سمندر گرفت

(۳) در باغِ مراد ما ز بیدادِ تگرگ
نے نخل بجائے ماند نے شاخ نہ برگ
چوں خانہ خراب است چہ نالیم ز سیل
چوں زیست وبال است چہ ترسیم ز مرگ

مراد کو باغ کہنے کی رعایت سے نامرادی کو بیدادِ تگرگ کہہ کر نخل، شاخ اور برگ کی تباہی کا ذکر کیا ہے۔

۲۰۔ صنعتِ عکس

کلام کے بعض اجزا کو مقدم اور موخر کر کے پھر موخر کو مقدم اور مقدم کو موخر لانا۔ مثلاً انیس۔

ع استادہ آب میں یہ روانی خدا کی شان
پانی میں آگ، آگ میں پانی خدا کی شان

کلام غالب سے عکس کی مثالیں:

(۱) وفورِ اشک نے کاشانے کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در، در و دیوار

(۲) ہے خیال حسن میں حسن عمل کا سا خیال
خلد کا اک در ہے میری گور کے اندر کھلا

(۳) بطالبانِ زر و سیم، سیم و زر فرخ
بسائلانِ تہی کاسہ ناں مبارک باد (قطعہ ۲۷)

(۴) رحمت عام است دائم خاص را
عشرتی خاص است ہر دم عام را (غزلیات)

(۵) صاحبقران ثانی اگر در جہاں نماند
گفتارِ من بہ ثانیِ صاحبقراں رسد (غزلیات)

(۶) نازِ سرمایۂ دیگر ز تو یافت
نمک خوانِ تو خوانِ نمک است (غزلیات)

۲۱۔ مذہبی کلامی

یعنی کلام کا دلیل و برہان پر مشتمل ہونا۔ کلام کا مدلل ہونا۔ عام طور پر شاعر ایک مصرع میں کوئی امر بیان کرتا ہے۔ اور دوسرے مصرع میں اُس بیان کے جواز میں کوئی دلیل پیش کرتا ہے۔ صائب کے اکثر اشعار

اسی صنعت میں ہیں۔ مثلاً

سفلۂ نوش پوش را در محفل تو دہ جا مدہ
کفش گر زریں بود بر سر نبایدش نہاد

غالب کے اکثر اشعار میں یہ صنعت موجود ہے۔ چند مثالیں دیکھئے:

(۱) رہا آباد عالم اہل ہمت کے نہ ہونے سے
بھرے ہیں جس قدر جام و سبو میخانہ خالی ہے

(۲) پاتے نہیں جب راہ تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع تو ہوتی ہے رواں اور

(۳) فروغ شعلۂ خس یک نفس ہے
ہوس کو پاس ناموس وفا کیا

(۴) آگ سے پانی میں بجھتے وقت اٹھتی ہے صدا
ہر کوئی درماندگی میں نالے سے ناچار ہے

(۵) زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

(۶) نے تیر کماں میں ہے نہ صیاد کمیں میں
گوشے میں قفس کے مجھے آرام بہت ہے

(۷) توی فتادہ چہ نسبت ادب مجو غالب
ندیدہ ای کہ سوی قبلہ پشت محراب است

(۸) کم خو گیر و بیش شو غالب
قطرہ از ترک خویشتن گہر است

۲۲۔ صنعت ادماج

یعنی کلام سے دو معنی حاصل ہوں۔ ایہام میں ایک لفظ دو معنی رکھتا ہے جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور ادماج میں پورے کلام کے دو معنی ہوتے ہیں۔ محتمل الضدین اور ادماج میں یہ فرق ہے کہ محتمل الضدین میں پورے کلام کے جو دو معنی ہوتے ہیں، وہ ایک دوسرے سے تضاد کا علاقہ رکھتے ہیں۔ ادماج میں دونوں معنی مختلف ضرور ہوتے ہیں، مگر ایک دوسرے کے متضاد نہیں ہوتے۔ مثلاً غالب

(۱) کیونکہ اُس بت سے رکھوں جان عزیز
کیا نہیں ہے مجھے ایمان عزیز

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں، کہ اگر اس سے جان عزیز رکھوں گا تو وہ ایمان لے لے گا۔ اس لئے جان کو عزیز نہیں رکھتا۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ اُس بت پر جان قربان کرنا توعین ایمان ہے۔ اور کیا مجھے ایمان عزیز نہیں ہے جو اُس سے جان کو عزیز رکھوں

(۲) ترے سرو قامت سے اک قد آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

اس کے ایک معنی تو یہ ہیں، کہ فتنۂ قیامت ترے سرو قامت سے کم ہے اور دوسرے معنی یہ کہ تیرا قامت فتنۂ قیامت سے تراشا گیا ہے اور فتنۂ قیامت بقدر تیرے قامت کے کم رہ گیا ہے۔

(۳) الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیونکر ہو

اس ایک مطلب تو یہ ہے، کہ تم جیسے نازک مزاج شہر میں اور بھی ہوں تو شہر کا کیا حال ہو۔ اور دوسرے معنی یہ ہیں، کہ جب تم کو اپنے عکس کا بھی اپنی مانند ہونا گوارا نہیں۔ اور اگر شہر میں فی الواقع تم جیسے ایک دو حسین موجود ہوں، تو تم کیا قیامت برپا کرو۔ یعنی تم کیسے برداشت کرو۔

(۴) کون ہوتا ہے حریف مے مردافگن عشق
ہے مکرر لب ساقی پہ صلا میرے بعد

اس شعر کے ایک معنی تو یہ ہیں، کہ میرے مرنے کے بعد شراب عشق کا کوئی خریدار نہیں رہا اور

اور سائل معشوق کو بار بار صلا دینے کی ضرورت پڑتی ہے۔ اور دوسرے لطیف معنی یہ ہیں کہ سائل مصرع دوبار کو مکرر پڑھتا ہے۔ ایک دفعہ بلانے کے لہجے میں یعنی کوئی ہے جو مردانگی عشق کا حریف ہو اور جب اس کی آواز پر کوئی نہیں آتا۔ تو اسی مصرع کو مایوسی کے ساتھ پڑھتا ہے۔ یعنی کوئی نہیں جو مردانگی کا حریف ہو۔

---

۲۳ ۔ صنعتِ تعجب

کلام میں تعجب کا پیدا کرنا یا تعجب کا اظہار کرنا۔ مثلاً غالبؔ

(۱)	قیامت ہے کہ سن لیلیٰ کا دشتِ قیس میں آنا	تعجب سے وہ بولا یوں بھی ہوتا ہے زمانے میں
(۲)	ضعف سے گریہ مبدل بہ دمِ سرد ہوا	باور آیا ہمیں پانی کا ہوا ہو جانا
(۳)	جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود	پھر یہ ہنگامہ اے خدا کیا ہے
(۴)	یہ پری چہرہ لوگ کیسے ہیں	غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے
(۵)	سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں	ابر کیا چیز ہے ہوا کیا ہے
(۶)	کون ہے جس کے در پہ ناصیہ سا	ہیں مہ و مہر و زہرہ و بہرام
(۷)	نقش فریادی ہے کس کی شوخیٔ تحریر کا	کاغذی ہے پیرہن ہر پیکرِ تصویر کا
(۸)	زہے ستارۂ گردش کہ جو اسے دیکھے	شعاعِ مہرِ درخشاں ہو اس کا تارِ نگاہ
(۹)	کیوں اندھیری ہے شبِ غم ہے بلاؤں کا نزول	آج ادھر ہی کو رہے گا دیدۂ اختر کھلا
(۱۰)	تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید	کس نے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا

---

۲۴ ۔ صنعتِ مبالغہ

یعنی کلام میں کسی بات کو بہت بڑھا چڑھا کر بیان کرنا۔ اگر کچھ زیبِ داستان کے لئے بڑھایا جائے تو اس کو تبلیغ کہتے ہیں۔ تبلیغ عقلاً اور عادتاً دونوں طرح سے ممکن ہوتی ہے۔ کچھ اور مبالغہ کیا جائے کہ عقل مان جائے اور عادتاً اس چیز کا امکان نہ ہو۔ یا عادتاً امکان ہو اور عقل اسے تسلیم نہ کرے۔ تو ایسے

مبالغہ کو اغراق کہتے ہیں، اور اگر اتنا مبالغہ کیا جائے کہ عقلاً اور عادتاً نا ممکن ہو تو اسے غلو کہتے ہیں۔

غالب نے نواب رامپور کلب علی خاں کے نام ایک قطعہ لکھا ہے اور اس میں مبالغہ کی تینوں قسموں کا ذکر کر کے اُن کے لیے دعا کرتے ہیں ؎

مدح کے بعد دُعا چاہیے اور اہلِ سخن — اس کو کرتے ہیں بہت بڑھ کے بہ اغراق رقم
ہم نہ تبلیغ کے مائل نہ غلو کے قائل — دو دعائیں ہیں کہ وہ دیتے ہیں نواب کو ہم
یا خدا غالبِ عاصی کے خداوند کو دے — وہ دو چیزیں کہ طلبگار ہے جن کا عالم
اولاً عمرِ طبیعی، بہ دوامِ اقبال — ثانیاً دولتِ دیدارِ شہنشاہِ امم

تبلیغ اور اغراق کی حد تک مبالغہ کرنا اردو اور فارسی شاعری میں جائز سمجھا جاتا ہے۔ اور غلو بنظرِ تحسین نہیں دیکھا جاتا۔ غالب نے مضامین گریہ اور مدح میں غلو سے بھی کام لیا ہے۔ ہم صرف غلو کی مثالیں پیش کرتے ہیں

(ا) مضامین گریہ:۔

(۱) اے عافیت کنارہ کر اے انتظام چل — سیلابِ گریہ درپئے دیوار و در ہے آج
(۲) واں کرم کو عذرِ بارش تھا عناں گیرِ خرام — گریے سے یاں پنبۂ بالش کفِ سیلاب تھا
(۳) غالب ہمیں نہ چھیڑ کہ پھر جوشِ اشک سے — بیٹھے ہیں ہم تہیۂ طوفاں کئے ہوئے
(۴) میں نے روکا رات غالب کو وگرنہ دیکھتے — اس کے سیلِ گریہ میں گردوں کفِ سیلاب تھا
(۵) گیتی ز گریہ ام تہ و بالاست، بعد ازاں — جویند در میانۂ دریا کنارہ را

(ب) مضامین مدحیہ:۔

(۱) زہے ز خویش نشانِ کمالِ صنع آلہ — سراجِ دینِ نبی بو ظفر بہادر شاہ
(۲) محیطِ بخشش و دریا کف و سحاب نوال — قمر لوائے و فلک خرگہ و ستارہ سپاہ
(۳) ز قہر اُو کہ بگردن کشاں دہد مالش — بگوشِ شیر دہد حلقہ از دمِ روباہ
(۴) فلک بہ لرزہ درانداز دے ز دستبردِ علم — زمیں بہ زلزلہ اندازدے ز دِ تیغِ سیاہ

---

(۱) چار سُو شگفِ فرخندہ شمائل کہ بدہر — بستہ بر دامنِ نظارہ ز فردوس طراز
(۲) آنکہ بر خاکِ درش چرخ پے عرضِ سجود — شب و روز از مہ و خورشید بود ناصیہ ساز (قصیدہ ۳۵)

(۱) من دیزم دلیم فریزد بجادر — کہ از جیب ہر گوشہ گوہر برآرد
(۲) ہوا از غباری کہ زاں عرصہ خیزد — فریدون و دارا دفیفر برآرد
(۳) ثریا بساط فلک بارگاہا — کہ قدرت وقدرا موقر برآرد
(۴) توآئی کہ در ہر قرم نقش پایت — زمیں کان گوگرد احمر برآرد
(۵) فلک جملہ دربارگاہ نوالت — درہ آرد گدا و توانگر برآرد
(۶) بقدر جلالت نیارد رسیدن — خرد از پر تو خویش گر پر برآرد
(۷) بس است اینکہ ہر صبح ہر کو دش — سری از گریبان خاور برآرد (قصیدہ ۴۰۵)

---

(۱) ہم کعبہ را زمیں بود وہم سر پر شاہ — در ہر دو قبلہ بار ملیرہاں برابر است
(۲) [illegible] گر تماں گفت توں گفت کہ شاہ — برتر از ہر چہ وراں گفت مکانے وارد

۲۵۔ صنعتِ ایراد المثل

یعنی کلام میں کسی مثل، ضرب المثل یا محاورہ کو باندھنا۔ غالب کے اردو کلام میں ضرب المثل یا محاورہ بہت کم باندھا گیا ہے تاہم چند مثالیں دیکھیے۔

(۱) کاؤ کاوِ سخت جانی ہائے تنہائی نہ پوچھ — صبح کرنا شام کا۔ لانا ہے جوئے شیر کا
(۲) شورِ پندِ ناصح نے زخم پر نمک چھڑکا — آپ سے کوئی پوچھے تم نے کیا مزا پایا
(۳) لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں — ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے
(۴) دشنے نے کبھی منہ نہ لگایا ہو جگر کو — خنجر نے کبھی بات نہ پوچھی ہو گلو کی
(۵) اے پرتوِ خورشیدِ جہاں تاب ادھر بھی — سائے کی طرح ہم پہ عجب وقت پڑا ہے
(۶) یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے — شرم سے پانی پانی ہونا ہے
(۷) تاک سے جی میں کیوں رہے ارماں — آئیے یہ گوئے ہے اور یہ میداں
(۸) دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال — ہو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ہونا

(۹) بختم زر زرم عیش بعزبت فشکد دمن — سستم چناں کہ پانشانم زسر بھور

۲۶ - صنعتِ ترجمۃ اللفظ

کلام میں کسی اور زبان کا لفظ لانا اور پھر اُس کے بعد ایک ایسا لفظ لانا جو پہلے لفظ کا ترجمہ ہو۔ اس صنعت میں کمال کا معیار یہ ہے کہ دو نو لفظ اس طرح سے لائے جائیں، کہ "آورد" کا اُس پر شبہ نہ ہو۔ غالب کے اشعار میں یہ صنعت اسی کمال کے ساتھ موجود ہے۔

دیکھئے :۔

(۱) لیتا ہوں مکتبِ غمِ دل میں سبق ہنوز — لیکن یہی کہ رفت گیا اور بود تھا

(۲) شکوے کے نام سے بے مہر خفا ہوتا ہے — یہ بھی مت کہہ کہ جو کہیئے تو گلا ہوتا ہے

(۳) تھا تنج زر ایک خرد پاس — رنگ کا زرد پر کہاں بُو باس

(۴) دے دعا کو مری وہ مرتبہ حسنِ قبول — کہ اجابت کہے ہر حرف پہ سو بار آمین

(۵) محرم نہیں ہے تو ہی نوا ہائے راز کا — یاں ورنہ جو حجاب ہے پردہ ہے ساز کا

(۶) کہاں ہے ساقیِ مہوش کہاں ہے ابرِ مطیر — بیار لائے گلنار گوں، بہار، برس

(۷) شب ورودِ افتخار لیل و نہار — مہ و سال اشرف شہور و سنین

(۸) فرشتہ سنی مَن دَبُّکَ لمی فہم — بمن بگوی کہ غالب بگوی خدائے تو کیست

(۹) درد ایں سو فشردہ یاد در دل — اشک آنسو دو دیدہ بر رخسار

اس شعر میں صنعت ایہام بھی ہے۔

(۱۰) از بس پُر است جیب مسمٰی ز نقدِ اسم — ہر جا الف بلنشت محاسب ہزار یافت

حرفِ اختتام

اس کتاب کے اختتام پر ہم پھر اس بات کا اعادہ کرتے ہیں۔ کہ اچھے شعر کے لیے دو صفات کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ ایک یہ خیال جو نظم کیا گیا ہے وُہ اچھا ہو۔ دوسرے جن الفاظ میں اچھے خیال کو ظاہر کیا گیا ہے۔ وہ بھی اچھے ہوں۔ مشہور مغربی شاعر شیلے نے شعر کی مختصراً یہی تعریف کی ہے۔ کہ کسی اعلیٰ، ارفع اور پاکیزہ خیال کو عمدہ، مناسب اور موزوں الفاظ میں ادا کرنا شعر ہے۔ خیال یا مضمون کی رفعت، پاکیزگی، عمدگی یا طرفگی پر بحث کرنا ہمارے موضوع سے خارج ہے۔ الفاظ کی عمدگی میں حسنِ الفاظ، حسنِ تراکیب، حسنِ تشبیہات، حسنِ استعارات، حسنِ تلمیحات، حسنِ تمثیل و محاورات اور صنایع بدایع وغیرہ شامل ہیں۔ تشبیہ و استعارہ کے بغیر شاعر خیال کی لطیف کیفیتوں کو کما حقہٗ ظاہر کر ہی نہیں سکتا۔ تلمیحات شاعر کو تطویل سے بچاتی ہیں۔ اور مختصر الفاظ میں تفصیل پیش کر دیتی ہیں۔ مناسب اختصار بھی کلام کی ایک خوبی ہے خَیْرُ الکلام مَا قَلَّ و دَلّ۔ اور یہ اختصار یا ایجاز تشبیہ، استعارہ، تلمیح یا کنایہ وغیرہ کی مدد سے حاصل ہوتا ہے۔ صنایع بدایع کلام کو دلکش، دل نشین، دل چسپ اور دلپذیر بناتے ہیں۔ اسی وجہ سے ہر اچھے شاعر کے کلام میں صنایع

بدایع پائے جاتے ہیں۔

الفاظ کے حسنِ انتخاب، حسنِ ترکیب اور حسنِ ترتیب سے صنایع بدایع از خود پیدا ہو جاتے ہیں۔ مگر شاعر کو چاہیے کہ صنایع بدایع پر اپنے کلام کی بنیاد نہ رکھے۔ اور صنایع بدایع کو ہی حاصل کلام نہ سمجھے۔ اقبالؔ، غالبؔ اور انشاؔ کے مندرجہ ذیل اشعار میں صنعتِ تجنیس قلب ہے۔ اقبالؔ اور غالبؔ کے کلام میں یہ صنعت اس طرح سے جلوہ گر ہے کہ اس میں آورد کا شائبہ تک نہیں۔ اور انشاؔ کے اشعار سے یوں ظاہر ہوتا ہے کہ شعر کی بنیاد اسی صنعت پر ہے اور سوائے اس صنعت کے پیدا کرنے کے شاعر کا ان اشعار سے اور کوئی مقصد نہ تھا۔

اقبالؔ ۔

عشق کے دام میں پھنس کر یہ رہا ہوتا ہے
برق گرتی ہے تو یہ نخل ہرا ہوتا ہے

رہا اور ہرا میں صنعت تجنیس قلب ہے۔ اور اس طرح سے الفاظ کے پردہ میں روپوش ہے کہ مشکل سے نظر آتی ہے۔ اب یہی صنعت غالبؔ کے کلام میں دیکھئے ۔

مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل
آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمایش
گویم مُشکل وگرنہ گویم مُشکل

کلام اور کامل میں صنعت تجنیس قلب ہے۔ لیکن ایسے انداز سے گویا قدرتی طور پر الفاظ کے دروبست اور ترتیب سے پیدا ہو گئی ہے اب دیکھئے۔ کہ انشاؔ نے اِن اشعار کی بنیاد ہی اس صنعت پر رکھی ہے۔

۱۔ مجھے کیوں نہ مار ڈالے تری زلفِ اُلٹ کے کافر
کہ سکھا رکھا ہے تو نے اسے لفظِ رام اُلٹا

۲۔ سحر ایک ماش پھینکا جو مجھے دکھا کے اُس نے
تو اشارہ میں نے تاڑا کہ ہے لفظِ شام اُلٹا

۳۔ جو تُو باتوں میں رُکے گا تو میں جانوں گا کہ سمجھا

مرے جان و دل کے مالک نے مرا کلام اُلٹا

۴۔ فقط اس لفافہ پر ہے کہ خط آشنا کو پہنچے

تو لکھا ہے اُس نے انشاؔ یہ ترا ہی نام اُلٹا

انشاؔ کے ان اشعار سے صاف ظاہر ہے کہ شاعر کا مقصد صرف صنعت قلب کا پیدا کرنا تھا۔ رام اور مار مقلوب کل ہیں معلوم ہوتا ہے کہ شاعر نے پہلے رام۔ شام۔ کلام اور انشاؔ کے الفاظ کو اُلٹ کر پڑھا۔ اور مار۔ مائش۔ مالک اور آشنا کے الفاظ ردیف۔ قافیہ اور وزن کی قید کے ساتھ شعر میں پرو دیئے۔ اس قسم کی صنعت گری مذموم ہے اور شاعری نہیں بلکہ تک بندی ہے۔ میرؔ، غالبؔ اور اقبالؔ میں ایسی کوئی مثال نہیں ملے گی۔ بایں ہمہ اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ کہ غالبؔ کے کلام میں صنایع بدایع کثرت سے موجود ہیں۔ لیکن عریاں نہیں مستور ہیں۔ بے حجاب نہیں زیر نقاب ہیں۔ اور حسن کلام کے اضافہ کا باعث ہیں۔ صرف صنعت طباق و تضاد یا ایہام تضاد نسبتاً زیادہ نمایاں ہیں۔ لیکن ان سے بھی کلام کی سلاست اور روانی میں فرق نہیں آتا۔ کلام غالبؔ بہر حال میں کلام غالب ہے۔

اس موقع پر میں بعض عزیزوں اور دوستوں کو ہدیۂ سپاس و شکر بھی پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں جناب غلام رسول صاحب مہرؔ کا بیحد ممنون ہوں کہ انہوں نے عدیم الفرصت ہونے کے باوجود اس کتاب کا تعارف لکھا ہے۔ جناب مہرؔ کہنہ مشق صحافی اور نکتہ داں، نکتہ سنج اور نکتہ شناس ادیب ہیں۔ اُن کا اس کتاب کو نظر تحسین سے دیکھنا اور اس کا تعارف لکھنا میرے لئے اس قدر باعث فخر ہے کہ ؎

کلاہِ گوشۂ دہقاں بآفتاب رسید

میں جناب لطیف عارف صاحب ایم اے معلّم ادبیات انگریزی، گورنمنٹ کالج ملتان کا بھی بہت مشکور ہوں۔ جنہوں نے مجھ سے یہ کتاب لکھوائی اور اُن کا شکریہ غالبؔ کے الفاظ میں ادا کرتا ہوں۔

مجھ سے غالبؔ یہ علائی نے غزل لکھوائی

ایک بیداد گرِ رنج فزا اور سہی

میں اپنے بیٹے شمیم اختر طارق اور اپنی بیٹی رخشندہ اختر عفت کا بھی بہت مشکور ہوں اور ان کی درازیٔ عمر، صحت اور خوشحالی کے لئے دست بدعا ہوں۔ اوّل الذکر میرے آرام و آسائش کا ہر گھڑی اتنا خیال رکھتا ہے کہ باید و شاید۔ اور ثانی الذکر نے وقتاً فوقتاً میرے مسودات کی ترتیب و تحریر میں میری معاونت کی ہے

میرے دل سے ہمیشہ اپنے سعادت مند بچوں کے لئے دُعا نکلتی رہتی ہے۔ ؎

خدا اش در ہمہ حال از بلا نگہدارد

میں اس کتاب کے نوجوان ناشر دیدہ میر کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں کہ انہوں نے اس کتاب کی طباعت اور اشاعت میں بڑی عرق ریزی اور دلسوزی سے کام لیا ہے۔ خدا اُن کے کاروبار میں برکت ڈالے۔ آمین

نذیر احمد

محاسنِ الفاظِ غالب

کا

غلط نامہ

نمبر شمار	نمبر صفحہ	سطر کا نمبر	غلط	صحیح
۱	فہرست مضامین	سات (باب سوم)	غالب کی صناعی	اردو شاعری میں صنائع بدیع
۲	ز	گیارہ	ڈاکٹر	پروفیسر
۳	ب	گیارہ	ٹل	تاثل
۴	〃	آخری سطر	کلام نیاسا	کلام کا نیاسا
۵	ج	آخری سطر	مرزا نشانده	و ز افشانده
۶	س	تیسری سطر	اوزانی	ارزانی
۷	ص	پہلی سطر	شر	شعر
۸	〃	چوتھی سطر	ہاں نہیں	ہاں اور نہیں
		دسویں سطر	متحد للمضمون	متحد المضمون
۹	ف	آخری سطر	نباع	بنا
۱۰	۵	پانچویں سطر	تسحرا	تسحراہ
۱۱	〃	۹	قافیہ	قافیہ
۱۲	〃	۲۰	دسرا	دوسرا
۱۳	۲	۲۲	دشوار......آساں	دشوار......آساں
۱۴	-	۱۴- (آخری لفظ)	ترتب	ترتیب
۱۵	۲۱	آخری سطر	پرندی گوئی	پرندی است گوئی

١٦	٢٢	چوتھی سطر	اپنائی	پہنائی
١٧	٢٤	تیسری سطر	بزناں	بزبان
١٨	٢٦	گیارھویں سطر	یک یک بار	یک بیک بار
١٩	٢٧	١٨	کفایات	کنایات
٢٠	٢٨	٢١	اسی زمانے المعجم	اسی زمانے میں المعجم
٢١	٢٩	١٣	فرق آتا	فرق نہیں آتا
٢٢	٣١	٢٢	رہرو	رہرو
٢٣	٣٤	پہلی سطر	شتیزہ	ستیزہ
٢٤	"	٥	سرخوشم	سرخوشم
٢٥	٣٥	١١	دمائیندہ	دمانیدہ
٢٦	٣٦	٨	صنعت	صنعت تلمیح
٢٧	٣٨	١١	قدرت	ندرت
٢٨	٤٢	٤	ابرود	ابروؤں
٢٩	"	١٠	محتب	محتسب
٣٠	٤٣	٩	ابیام	ایہام
٣١	٤٤	٥	اوردو کی	اردو کی
٣٢	٤٥	١٢	سلامت	سلاست
٣٣	٤٦	٤	چراغ ہو	چراغ ہوا
٣٤	"	٦	باغ باغ ہو	باغ باغ ہوا
٣٥	"	٢١	بھولے	بھولے ہے
٣٦	"	آخری سطر	وو ..... گنگا	وہ ..... گنگا

۳۷	۵۱	۱۹	ترزیج	تدریج
۳۸	۵۲	۱۲	توریہ	توزیہ
۳۹	۵۶	۳	تک	تنک
۴۰	〃	۱۴	معرے	مرے
۴۱	۶۱	۲	حسین	عین
۴۲	〃	۱۱	ماشں	ماشں
۴۳	۶۳	۴	تاکید ازم	تاکید اقدم
۴۴	۶۴	۲۰	کاتتے ہیں	کاٹتے ہیں
۴۵	۶۵	۱۸	ظہ	ظفر
۴۶	۶۶	چھٹی سطر کا آخری لفظ	عنبر	عبیر
۴۷	۶۸	۹	دو	دونو
۴۸	۶۹	۴	ہیرے کو یاقوت	ہیرے کو ادر یاقوت
۴۹	۷۰	۱۹، ۲۲	رشک	اشک
۵۰	۷۷	۱۰	تو دس کی عمر	تو دس سال کی عمر
۵۱	۹۳	۱۸	بلندی زمین	بلندی اور زمین
۵۲	۹۵	۲۱	بزمت	بزمست
۵۳	۱۰۲	〃	کیا ...... کیا	کیا ...... کیا
۵۴	〃	آخری سطر	برق دم ...... قدم	برق دم ...... قدم
۵۵	۱۰۹	۹	غالب اس بلارغ	غالب است بلارغ
۵۶	۱۱۳	۷	دو دو چار	چار چار
۵۷	۱۴۰	۲۰	تودمتیز	خودمتیز